آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے باقاعدہ تصدیق اشاعت ABC CERTIFIED انسانی حقوق پر پاکستان کا پہلا جریدہ

ماہنامہ ہیومن رائٹس پوسٹ کراچی

ورک فرام ہوم کا تجربہ

اسٹریٹ کرائمز قابو سے باہر کیوں؟

سال 2020 میں عالمی افق پر رونما ہونے والے اہم واقعات

بھارت کے مختلف حصوں میں متنازع شہریت قانون کی منظوری کے خلاف مظاہروں نے متعدد مرتبہ پرتشدد صورت اختیار کی

Regd.SS-No.1260

انسانی حقوق پر پہلی نیوز ایجنسی، حکومت پاکستان سے منظور شدہ

HRNW

اردو اور انگریزی میں خبروں کی ترسیل

www.hrnww.com hrnww.com/urdu

قوموں کی ترقی اور عروج وزوال کا راز

آپ حیران ہوں گے میٹرک کلاس کا پہلا امتحان برصغیر پاک و ہند 1858ء میں ہوا اور برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ برصغیر کے لوگ ہماری عقل سے آدھے ہوتے ہیں اس لیے ہمارے پاس "پاسنگ مارکس "65 ہیں تو برصغیر والوں کے لیے 32 اعشاریہ 5 ہونے چاہئیں۔ دو سال بعد 1860ء میں اساتذہ کی آسانی کے لیے پاسنگ مارکس 33 کر دیے گئے اور ہم آج بھی ان ہی 33 نمبروں سے اپنے بچوں کی ذہانت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

جاپان کی مثال لے لیں تیسری جماعت تک بچوں کو ایک ہی مضمون سکھایا جاتا ہے اور وہ "اخلاقیات" اور "آداب" ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا "جس میں ادب نہیں اس میں دین نہیں"۔ مجھے نہیں معلوم کہ جاپان والے حضرت علیؓ کو کیسے جانتے ہیں اور ہمیں ابھی تک ان کی یہ بات معلوم کیوں نہ ہو سکی۔ بہر حال، اس پر عمل کی ذمہ داری فی الحال جاپان والوں نے لی ہوئی ہے۔ ہمارے ایک دوست جاپان گئے اور ایئرپورٹ پر پہنچ کر انہوں نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ ایک استاد ہیں اور پھر ان کو لگا کہ شاید وہ جاپان کے وزیراعظم ہیں۔ یہ ہے قوموں کی ترقی اور عروج وزوال کا راز۔

اشفاق احمد صاحب کو ایک دفعہ اٹلی میں عدالت جانا پڑا اور انہوں نے بھی اپنا تعارف کروایا کہ میں استاد ہوں وہ لکھتے ہیں کہ جج سمیت کورٹ میں موجود تمام لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہو گئے اس دن مجھے معلوم ہوا کہ قوموں کی عزت کا راز استادوں کی عزت میں ہے۔ آپ یقین کریں استادوں کو عزت وہی قوم دیتی ہے جو تعلیم کو عزت دیتی ہے اور اپنی آنے والی نسلوں سے پیار کرتی ہے۔ جاپان میں معاشرتی علوم "پڑھائی" نہیں جاتی ہے کیونکہ یہ سکھانے کی چیز ہے اور وہ اپنی نسلوں کو بہت خوبی کے ساتھ معاشرت سکھا رہے ہیں۔ جاپان کے اسکولوں میں صفائی ستھرائی کے لیے بچے اور اساتذہ خود ہی اہتمام کرتے ہیں، صبح آٹھ بجے اسکول آنے کے بعد سے 10 بجے تک پورا اسکول بچوں اور اساتذہ سمیت صفائی میں مشغول رہتا ہے۔

دوسری طرف آپ ہمارا تعلیمی نظام ملاحظہ کریں جو صرف نقل اور چھپائی پر مشتمل ہے، ہمارے بچے "پبلشرز" بن چکے ہیں۔ آپ تماشہ دیکھیں جو کتاب میں لکھا ہوتا ہے اساتذہ اسی کو بورڈ پر نقل کرتے ہیں، بچے دوبارہ اسی کو کاپی پر چھاپ دیتے ہیں، اساتذہ اسی نقل شدہ اور چھپے ہوئے مواد کو امتحان میں دیتے ہیں، خود ہی اہم سوالوں پر نشانات لگواتے ہیں اور خود ہی پیپر بناتے ہیں اور خود ہی اس کو چیک کر کے خود نمبر بھی دے دیتے ہیں، بچے کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیتے ہیں اور ماں باپ اس نتیجے پر تالیاں بجا بجا کر بچوں کے ذہین اور قابل ہونے کے گن گاتے رہتے ہیں، جن کے بچے فیل ہو جاتے ہیں وہ اس نتیجے پر افسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے بچے کو "کوڑھ مغز" اور "کند ذہن" کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔

آپ ایمانداری سے بتائیں اس سب کام میں بچے نے کیا سیکھا، سوائے نقل کرنے اور چھاپنے کے؟ ہم 13، 14 سال تک بچوں کو قطار میں کھڑا کر کر کے اسمبلی کرواتے ہیں اور وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہی قطار کو توڑ کر اپنا کام کرواتے ہیں، جو جتنے بڑے اسکول سے پڑھا ہوتا ہے قطار کو روندتے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام کروانے کا ہنر جانتا ہے۔ ہم پہلی سے لے کر اور دسویں تک اپنے بچوں کو "سوشل اسٹڈیز" پڑھاتے ہیں اور معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ بتانے اور سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ ہم نے کتنا "سوشل" ہونا سیکھا ہے؟ اسکول میں سارا وقت سائنس "رٹنے" گزرتا ہے اور آپ کو پورے ملک میں کوئی "سائنس دان" نامی چیز نظر نہیں آئے گی کیونکہ بدقسمتی سے سائنس "سیکھنے" کی اور خود تجربہ کرنے کی چیز ہے اور ہم اسے بھی "رٹنا" لگواتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اسکولز کے پرنسپل صاحبان اور ذمہ دار اساتذہ اکرام سر جوڑ کر بیٹھیں اس "گلے سڑے" اور "بوسیدہ" نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینکیں، بچوں کو "طوطا" بنانے کے بجائے "قابل" بنانے کے بارے میں سوچیں۔

پاکستان میں کاٹن کی پیداوار کے خاتمے کی شروعات

کاٹن کی پیداوار میں مسلسل کمی پر کاٹن جنرز ایسوسی ایشن کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اس سال پاکستان میں مسلسل تیسرے سال کاٹن کی پیداوار میں جنوری تک 34 فیصد کمی سے صرف 5.5 ملین بیلز کی پیداوار ہوئی ہے جو گزشتہ سال سے 3 ملین بیلز اور 30 برسوں میں سب سے کم ہے۔ گزشتہ سال ہماری کاٹن کی پیداوار 8.5 ملین بیلز تھی۔ ہماری کاٹن کی زیادہ سے زیادہ پیداوار 14 ملین بیلز اور اوسطاً 12 سے 13 ملین بیلز رہی جسے دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں کاٹن کی پیداوار کے خاتمے کی شروعات ہو چکی ہے جبکہ بھارت میں کاٹن کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ انڈین کاٹن ایسوسی ایشن کے مطابق 2019-20 میں بھارت کی کاٹن کی پیداوار 36 ملین بیلز تھی۔ بھارت دنیا میں امریکہ اور برازیل کے بعد کاٹن ایکسپورٹ کرنے والا تیسرا بڑا ملک بن چکا ہے اور دنیا میں کاٹن کی پیداوار کا 25 فیصد حصہ رکھتا ہے۔ بھارت نے بی ٹی کاٹن کے جدید بیج استعمال کر کے اپنی کاٹن پیداوار کو چند سالوں میں دگنا کر لیا ہے جبکہ ہم کاٹن کی پیداوار میں مسلسل کمی سے 13 ملین بیلز سے 5.5 ملین بیلز کی نچلی ترین سطح پر آ گئے ہیں جس کی وجہ غیر معیاری بیج اور ادویات ہیں جس کے باعث کپاس کے کاشتکار گنے اور دوسری فصلوں کی کاشت پر منتقل ہو رہے ہیں۔ کاٹن کی پیداوار میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سیلز ٹیکس بچانے کیلئے اس سال کافی کاٹن کیش پر Unofficially خریدی گئی جو کاٹن کی آفیشل پیداوار میں شامل نہیں ہے۔ اس عمل کو روکنے کیلئے ٹیکسٹائل کو زیرو ریٹڈ سیلز ٹیکس کرنا ہوگا۔

کپاس قومی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے اور پاکستان کے سب سے اہم ٹیکسٹائل سیکٹر کا دارومدار کپاس کی پیداوار پر ہے۔ ہمارا ٹیکسٹائل سیکٹر ملک کی مجموعی ایکسپورٹ کا 60 فیصد اور مینوفیکچرنگ سیکٹر میں 40 فیصد ملازمتیں فراہم کرتا ہے جبکہ ملکی جی ڈی پی میں اس سیکٹر کا شیئر 9 سے 10 فیصد ہے۔ کپاس ٹیکسٹائل کا خام مال ہے جس سے ٹیکسٹائل کی مختلف مصنوعات بنا کر ایکسپورٹ کی جاتی ہیں۔ چند سال پہلے تک ہم دنیا میں کاٹن یارن کے دوسرے بڑے ایکسپورٹر تھے۔ کاٹن کی پیداوار میں مسلسل کمی اور پاک بھارت تجارت بند ہونے کی وجہ سے ہمیں ہر سال 2 ارب ڈالر کی کپاس برازیل اور دیگر ممالک سے امپورٹ کرنا پڑ رہی ہے اور ہر سال کاٹن امپورٹ میں اضافہ ہو رہا ہے جو زرمبادلہ کے ذخائر پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے۔ مقامی مارکیٹ میں کپاس کی کمی کے باعث کاٹن کی قیمتیں 11 ہزار روپے فی من سے زائد تک پہنچ چکی ہیں جس کی وجہ سے کاٹن یارن کی قیمتوں میں بھی 40 فیصد اضافہ ہوا ہے جو ٹیکسٹائل ایکسپورٹ میں ہماری مقابلاتی سکت متاثر کر رہا ہے۔ کاٹن کی کاشت کے رقبے اور پیداوار بڑھانے کیلئے حکومت کو خیبر پختونخواہ اور بلوچستان میں کپاس کی کاشت کیلئے مراعات دینا ہوں گی۔ اسٹیٹ بینک کی رپورٹ کے مطابق اس سال صرف 2.5 ملین ہیکڑ رقبے پر کاٹن کاشت کی گئی ہے جو 1982 کے بعد سے کاٹن کی کاشت کا کم ترین رقبہ ہے جبکہ چند سال پہلے پاکستان میں کاٹن کی کاشت کا رقبہ 3.2 ملین ہیکڑ تھا۔ اس کے برعکس آج بھارت 12 ملین ہیکڑ رقبے پر کاٹن کی کاشت کر کے دنیا میں کپاس پیدا کرنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا ہے۔ دنیا میں کاٹن کی پیداوار میں بھارت کا حصہ 25 فیصد ہے جبکہ دوسرے نمبر پر چین 23 فیصد، تیسرے نمبر پر امریکہ 15 فیصد اور چوتھے نمبر پر برازیل کا 10 فیصد حصہ ہے، یہ چاروں ممالک دنیا کا 73 فیصد کاٹن پیدا کرتے ہیں۔

پنجاب میں اس سال جنوری کے آخر تک 3.4 ملین بیلز کپاس پیدا ہوئی ہے جبکہ گزشتہ سال پنجاب میں اسی دورانیے میں کپاس کی پیداوار 5 ملین بیلز سے زیادہ تھی۔ اس لحاظ سے اس سال پنجاب میں 31.5 فیصد کپاس کی کم پیداوار ہوئی جبکہ سندھ میں اس سال کپاس کی پیداوار 2.1 ملین بیلز ہوئی جبکہ گزشتہ سال اس کی پیداوار 3.5 ملین بیلز تھی۔ اس طرح اس سال سندھ میں کپاس 38.5 فیصد کم پیدا ہوئی۔ کاٹن ایکسپرٹ نسیم عثمان کے مطابق 2021 میں کاٹن کی شارٹ فال 4.5 سے 5.5 ملین بیلز تک پہنچ سکتی ہے، ہماری ٹیکسٹائل صنعت نے رواں مالی سال جولائی سے دسمبر تک ایک ارب ڈالر کی کپاس امپورٹ کی جبکہ گزشتہ مالی سال اسی دورانیے میں 543 ملین ڈالر کی کپاس امپورٹ کی گئی تھی۔

نسیم عثمان کے مطابق جون 2021 تک کاٹن کی امپورٹ 3 ارب ڈالر تک پہنچ سکتی ہے۔ کاٹن امپورٹ کرنے میں کپاس کی قیمت میں تقریباً 15 فیصد اضافہ ہو جاتا ہے جو پیداواری لاگت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

وزیراعظم زراعت کیلئے نئے پیکیج کا اعلان کرنے والے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ پیکیج میں کاٹن کی پیداوار بڑھانے کیلئے مراعات دی جائیں، کپاس کے کاشتکاروں کو نقلی بیج اور ادویات کی سپلائی کو روکا جائے اور کاٹن کی فی ایکڑ پیداوار بڑھانے کیلئے اصلی بیجوں اور ادویات کی فراہمی یقینی بنائی جائے تاکہ کاشتکار کپاس کی کاشت کو ترجیح دیں۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ہمارے ایگریکلچر ریسرچ اداروں نے کپاس کے نئے بیج دریافت نہیں کئے اور نہ ہی حکومت نے بی ٹی کاٹن جیسے زیادہ فی ایکڑ پیداوار والے بیجوں کو پاکستان میں سرکاری طور پر متعارف کرایا ہے جبکہ کاٹن میں آلودگی کی روک تھام کیلئے بھی کوئی سنجیدہ اقدامات نہیں کئے گئے۔ کاٹن کی مسلسل پیداوار میں کمی سے 13 ارب ڈالر ایکسپورٹ اور مینوفیکچرنگ میں سب سے زیادہ ملازمتیں فراہم کرنے والا اہم ٹیکسٹائل سیکٹر بری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔ ٹیکسٹائل سیکٹر کی خام مال ہونے کی وجہ سے صنعت کو کپاس کی سالانہ کم از کم 11 ملین بیلز کھپت ہے جس کی مقامی سطح پر دستیابی حکومت کو یقینی بنانا ہوگی۔

مہنگائی مافیا سرگرم

موجودہ حکومت اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود مہنگائی کے حوالہ سے عوام کو کوئی ریلیف نہیں دے سکی اور حکومتی وزراء کے تمام بیانات اب تک کھوکھلے ثابت ہوئے۔ بجلی، گیس اور پیٹرول کے نرخوں میں آئے روز اضافہ کیا جارہا ہے لیکن غریب طبقہ کا کسی کو احساس نہیں۔ مہنگائی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور عام آدمی کیلئے معمولات زندگی جاری رکھنا مشکل سے مشکل تر ہو گیا ہے۔ تمام تر حکومتی اقدامات کے باوجود چینی کی قیمتوں میں اضافہ کو روکا نہیں جا سکا ہے۔ رمضان کی آمد سے قبل ایک بار پھر چینی مافیا سرگرم ہو گیا ہے اور انہوں نے چینی کی قیمتوں میں من مانا اضافہ کر دیا ہے، ادارہ شماریات کی جانب سے جاری اعداد و شمار بھی ملک بھر میں چینی کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کا اعتراف کر رہے ہیں۔ ادارہ شماریات کے مطابق گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران ملک کے بڑے شہروں میں چینی کی فی کلو قیمت میں 4 سے 5 روپے کا اضافہ دیکھنے میں آیا، کراچی میں گذشتہ ایک ہفتہ کے دوران فی کلو چینی کی قیمت 5 روپے اضافہ کے ساتھ 100 روپے فی کلو تک جا پہنچی ہے جبکہ لاہور میں ایک ہفتہ کے دوران چینی کی قیمتوں پر 4 روپے فی کلو کا اضافہ دیکھا گیا۔ دوسری جانب یوٹیلیٹی اسٹورز ذرائع نے بتایا کہ اس وقت بھی یوٹیلیٹی اسٹورز پر چینی 68 روپے فی کلو کے حساب سے صارفین کو دی جارہی ہے، یوٹیلیٹی اسٹورز کے پاس وافر مقدار میں چینی کا ذخیرہ موجود ہے، یوٹیلیٹی اسٹورز پر چینی کی کمی سے متعلق خبروں میں کوئی صداقت نہیں۔ ذرائع نے بتایا کہ چینی کی ذخیرہ اندوزی کو روکنے کے لئے ایک شخص کو ایک وقت میں صرف چار کلو چینی خریدنے کی اجازت ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ مارکیٹ قیمتوں میں فرق سے ذخیرہ اندوزی کا خطرہ ہوتا ہے۔ یوٹیلیٹی اسٹورز ذرائع نے بتایا کہ حکومت کی جانب سے دی گئی اشیاء پر سبسڈی دینے کا عمل جاری ہے۔ دیکھا جائے تو بظاہر محسوس یہی ہوتا ہے کہ آنے والے وقت میں عوام کیلئے دو وقت کی روٹی کا حصول بھی جوئے شیر لانے کے برابر ہو جائے گا اور اشیائے خورد و نوش عام آدمی کی دسترس سے بہت دور چلی جائیں گی، حکومت کو چاہیے کہ سب سے پہلے مہنگائی کا کنٹرول کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کرے اور عوام کو ریلیف دے۔

آپریشن ردالفساد کے چار سال

اب سے چند سال پہلے جب وطن عزیز میں دہشت گردی عروج پر تھی تو پاک فوج نے ملک دشمن عناصر کو کچلنے کیلئے ایک گرینڈ آپریشن ''ردالفساد'' کا آغاز کیا تھا جس کے نتیجہ میں بہت سے دہشت گرد مارے گئے، کچھ پکڑے گئے اور کچھ فرار ہو گئے اس آپریشن جو آج بھی جاری ہے کے نتیجہ میں ملک میں امن و امان کی صورتحال میں کافی بہتری آئی ہے اور اس آپریشن کے چار سال مکمل ہونے پر پاک فوج کے ترجمان میجر جنرل بابر افتخار نے کہا کہ عوام فوج کی طاقت ہوتی ہے عوام ساتھ ہو تو فوج کچھ بھی کر سکتی ہے، اس بار 23 مارچ کو یوم پاکستان بھرپور طریقہ سے منائیں گے، یوم پاکستان کا مقصد ہے ایک قوم، ایک منزل، عوام کے تعاون سے ہر چیلنج پر قابو پائیں گے، دہشت گردوں نے پاکستان کو مفلوج کرنے کی کوشش کی جسے پاک فوج نے ناکام بنا دیا، امن کا سفر کامیابی سے جاری رہے گا۔ عوام کی مدد سے ہی ملک سے دہشت گردی کا خاتمہ کیا۔ قبائلی علاقوں میں ریاست کی رٹ بحال ہو گئی ہے، طاقت کا استعمال صرف ریاست کی صوابدید ہے، آپریشن ردالفساد کو چار سال مکمل ہو گئے۔ نیشنل ایکشن پلان کے مکمل اہداف حاصل کریں گے، پاکستان نے افغان امن کیلئے بہت مثبت کردار ادا کیا، پوری دنیا افغان امن کیلئے پاکستان کے کردار کو سراہتی ہے، پاکستان کے ڈومزیئر کو عالمی برادری نے سراہا۔ پاک فوج کے ترجمان اور شعبہ تعلقات عامہ آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل بابر افتخار نے صحافیوں کو بریفنگ دیتے ہوئے بتایا کہ آپریشن ردالفساد کا مقصد ایک پرامن اور مستحکم پاکستان تھا اور ہر پاکستانی اس آپریشن کا سپاہی ہے انہوں نے کہا کہ 22 فروری 2017 کو آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ کی قیادت میں آپریشن ردالفساد کا آغاز کیا گیا، اس آپریشن کی بنیادی اہمیت جو اسے دیگر تمام اہمیت سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپریشن کسی مخصوص علاقے پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس کا دائرہ کار پورے ملک پر محیط تھا، اس کا اسٹریٹجک مقصد ایک پرامن، مستحکم پاکستان تھا اور ہے، جس میں عوام کا ریاست پر اعتماد بحال ہو اور دہشت گردوں اور شر پسند عناصر کی آزادی کو سلب کر کے انہیں مکمل طور پر غیر موثر کر دیا جائے۔ ردالفساد کا بنیادی محور عوام ہیں کیونکہ جب مسلح فورس دہشتگردوں سے لڑ رہی ہوتی ہے تو دہشت گردی اور عسکریت پسندی کو صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں اور معاشرے کی طاقت سے شکست دی جا سکتی ہے۔ وطن عزیز سے دہشت گردی کے خاتمہ کیلئے حکومت اور پوری قوم پہلے کی طرح آج بھی پاک فوج کے ساتھ ہے اور انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب وطن عزیز سے دہشت گردی کا مکمل خاتمہ ہو جائیگا۔

سیاسی جماعتیں برداشت اور تحمل کا مظاہرہ کریں

بلاشبہ ڈسکہ میں ضمنی الیکشن کے حوالہ سے الیکشن کمیشن کے فیصلہ کو اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے خوش آئند قرار دیا جارہا ہے جبکہ حکومت کی جانب سے الیکشن کمیشن کے فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کرنے کا اعلان کیا گیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا بلاشبہ ضمنی الیکشن کے موقع پر سیاسی جماعتوں کی جانب سے فائرنگ اور ہلڑ بازی کے واقعات قابل مذمت ہیں اور اس دوران فائرنگ سے دو افراد کی جانوں کا ضیاع نہ صرف باعث افسوس ہے بلکہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے بلاشبہ ملک میں جس تیزی کے ساتھ عدم برداشت کا رویہ جنم لے رہا ہے وہ انتہائی خطرناک اور مستقبل میں عام انتخابات کو مزید پیچیدہ کرنے کے مترادف ہوگا کیونکہ ڈسکہ میں جس طرح کے واقعات پیش آئے اگر ان کی روک تھام کیلئے اقدامات نہ کیے گئے تو عام انتخابات میں اس کے منفی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ملک آج جس بحرانی صورتحال سے دوچار ہے اور معاشی طور پر مشکلات درپیش ہیں ایسی صورتحال میں ملک مزید بحرانوں کا متحمل نہیں ہو سکتا اور ملک کو درپیش بحرانوں سے نکالنے کی ذمہ داری صرف حکومت کی نہیں بلکہ تمام سیاسی قوتوں کی ہے چاہے وہ اپوزیشن میں ہوں یا حکومت میں ہوں انہیں ملک اور قوم کو بحران سے نکالنے کیلئے اپنی قومی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے بلاشبہ کوئی بھی حکومت تنہا ملک کو بحرانوں سے نکال سکتی اس کیلئے اسے اپوزیشن جماعتوں کا تعاون درکار ہوتا ہے مگر بدقسمتی سے یہاں گنگا الٹی بہتی ہے سیاسی جماعتیں جب برسر اقتدار ہوتی ہیں تو ان سے زیادہ محب وطن اور عوام دوست کوئی دوسرا نہیں ہوتا مگر جونہی وہ اپوزیشن میں جاتی ہیں اپنی تمام قومی ذمہ داریوں کو فراموش کر کے برسر اقتدار جماعت کی ٹانگیں کھینچنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں جو مہذب قوموں کی نشانی نہیں لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں آپس میں برداشت اور تحمل مزاجی کے ساتھ معاملات کو چلائیں تاکہ ملک اور قوم کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔

سال 2020 میں عالمی افق پر رونما ہونے والے اہم واقعات

دنیا بھر میں سال کا بڑا حصہ کورونا وائرس اور اس سے منسلک واقعات اور تنازعات کی نذر رہا

سال 2020 کے تیسرے ہی روز سب سے بڑی خبر جو سامنے آئی وہ ایرانی پاسداران انقلاب کی قدس فورس کے سربراہ میجر جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت کی تھی

بھارت کے مختلف حصوں میں متنازع شہریت قانون کی منظوری کے خلاف مظاہروں نے متعدد مرتبہ پرتشدد صورت اختیار کی

افغانستان میں شروع ہونے والی جنگ کے خاتمے کے لیے امریکا اور طالبان کے درمیان 29 فروری 2020 کو تاریخی امن معاہدے پر دستخط کیے گئے

ثوبیہ شاہد

سال 2020 کی ابتدا پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر نوع انسانی کو نئی چیزوں سے روشناس کروانے والے جس معاملے سے ہوئی تھی اس کا اختتام بھی اسی کے ساتھ ہوا۔

یہاں ہم بات کررہے ہیں عالمی وبا کورونا وائرس کی جو جدید دنیا میں انسانوں کو متاثر کرنے والا وہ واحد معاملہ ہے جو سال کے اختتام پر بھی اسی طرح نہ صرف زبان زد عام ہے جیسے آغاز میں تھا بلکہ ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی یہ انسانوں کے لیے اب بھی بڑی حد تک معمہ بنا ہوا ہے۔

حالانکہ دنیا بھر میں سال کا بڑا حصہ کورونا وائرس اور اس سے منسلک واقعات اور تنازعات کی نذر رہا تاہم کچھ اور اہم عالمی واقعات بھی رونما ہوئے جنہیں ہم یہاں قلمبند کررہے ہیں۔

ایرانی جنرل کی ہلاکت اور اس سے جُڑے معاملات

سال 2020 کے آغاز کے ساتھ تیسرے ہی روز سب سے بڑی خبر جو سامنے آئی وہ امریکی فضائی حملے میں ایرانی پاسداران انقلاب کی قدس فورس کے سربراہ میجر جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت کی تھی، انتہائی اہم فرد کی ہلاکت طویل عرصے سے امریکا کے ساتھ تنازع میں گھرے ایران کے لیے بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔

اس واقعے کے 2 روز بعد ہی 5 جنوری کو ایران نے عالمی طاقتوں کے ساتھ 2015 میں کیے گئے جوہری معاہدے سے مکمل طور پر دستبرداری کا اعلان کردیا تھا جس سے امریکا پہلے ہی علیحدہ ہوچکا تھا۔

قاسم سلیمانی پاسدارانِ انقلاب کی بیرونِ ملک موجود شاخ کی سربراہی کرتے تھے ساتھ ہی ایرانی صدر حسن روحانی کی انتظامیہ نے کہا تھا کہ 'ایران یورینیم کی افزودگی، ذخیرہ شدہ افزودہ یورینیم کی مقدار کے ساتھ اپنی جوہری سرگرمیوں میں تحقیق و ترقی میں کسی بھی قسم کی حد بندی نہیں رکھے گا۔

تاہم حیرت انگیز طور پر نومبر میں ہونے والے امریکی انتخابات میں ڈیموکریٹ اُمیدوار جوبائیڈن کی

کامیابی کے بعد ایران نے پیش کش کی کہ اگر امریکا تہران پر عائد اقتصادی پابندیاں ختم کردے تو ایران 2015 کے جوہری معاہدے کی مکمل پاسداری کرے گا۔

اس سے قبل القدس فورس کے سربراہ جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت سے پیدا ہونے والی کشیدگی کے دوران ہی ایران نے اس کے جواب میں عراق میں امریکا اور اس کی اتحادی افواج کے 2 فوجی اڈوں پر بیلسٹک میزائل داغے تھے۔

ایران کی جانب سے اس حملے میں 80 امریکی فوجیوں کی ہلاکت کا دعویٰ کیا گیا تھا، رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ امریکی ہیلی کاپٹرز اور فوجی ساز و سامان کو بھی 'سخت نقصان' پہنچا ہے۔

تاہم امریکی سینٹرل کمانڈ نے انکشاف کیا تھا کہ ایران کی جانب سے امریکی فوجی اڈوں پر کیے گئے میزائل حملوں میں 11 امریکی فوجی زخمی ہوئے تھے اور کسی بھی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔

بعد ازاں پینٹاگون نے ایک بیان میں بتایا کہ عراق میں قائم اڈے میں ہونے والے ایرانی میزائل حملوں کے بعد 34 فوجیوں میں دماغی چوٹ کی تشخیص ہوئی تھی۔

دوسری جانب ایران کے جوہری پروگرام سے متعلق 2015 کے معاہدے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنے والے ممالک اب بھی اس بات پر مصر ہیں کہ نئی امریکی انتظامیہ کے تحت معاہدے میں امریکی واپسی کے امکان کو مثبت انداز میں حل کیا جائے اور جرمنی کے وزیر خارجہ نے ایران پر زور دیا تھا کہ وہ معاہدہ

بچانے کے اس موقع کو ضائع نہ کرے جو اسے آخری ونڈو کہتے ہیں۔

نئی دہلی فسادات

بھارت کے مختلف حصوں میں متنازع شہریت قانون کی منظوری کے خلاف 2019 کے اواخر سے مظاہرے جاری تھے اوران مظاہروں نے متعدد مرتبہ پر تشدد صورت اختیار کی اور اس دوران صورتحال خاصی کشیدہ بھی رہی۔

فسادات میں جس پوری مارکیٹ کو جلا کر راکھ کیا گیا وہاں زیادہ تر دکانیں مسلمانوں کی تھیں تاہم رواں برس فروری میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے پہلے بھارتی دورے کے دوران 23 فروری کو بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں جاری مظاہرے اچانک سنگین مذہبی فسادات کی صورت اختیار کر گئے۔ یہاں ہم آپ کو شہریت ترمیمی بل کے بارے میں بتاتے چلیں کہ سال 2019 میں 11 دسمبر کو بھارتی پارلیمنٹ سے شہریت ترمیمی ایکٹ منظور ہوا تھا جس کے تحت 31 دسمبر 2014 سے قبل 3 پڑوسی ممالک سے بھارت آنے والے ہندوؤں، سکھوں، بدھ مت، جینز، پارسیوں اور عیسائیوں کو بھارتی شہریت دی جائے گی جبکہ اس فہرست میں مسلمان شامل نہیں تھے۔

چنانچہ بھارتی دارالحکومت میں ہوئے فسادات کے دوران کم از کم 53 افراد جاں بحق اور 200 سے زائد زخمی ہوئے تھے جن میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

جس کے بارے میں ایک انکشاف یہ بھی سامنے آیا کہ ان فسادات میں دہلی پولیس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو ہدف بنایا تھا۔

ان فسادات میں زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا اور انتہا پسندوں نے مسجد کو بھی نذر آتش کر دیا اس حوالے سے انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ فسادات میں دہلی پولیس انسانی حقوق کی سنگین خلاف پامالی کی مرتکب ہوئی، دہلی پولیس نے مظاہرین پر تشدد کیا اور انہیں گرفتار کیا جبکہ ہندو حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔

ایمنسٹی کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 'ان فسادات میں مسلمانوں کا نقصان ہندوؤں کے مقابلے میں 3 گنا زیادہ تھا، جس میں مسلمانوں کی جائیدادوں اور کاروبار کو بھی نذر آتش کیا گیا تھا'۔

امریکا-طالبان امن معاہدہ

سال 2001 میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد افغانستان میں شروع ہونے والی جنگ کے خاتمے کے لیے امریکا اور طالبان کے درمیان 29 فروری 2020 کو تاریخی امن معاہدے پر دستخط کیے گئے۔

طالبان کے ساتھ امن معاہدے کی باتیں افغان اور امریکی رہنماؤں کی جانب سے گزشتہ ایک دہائی سے کی جارہی تھیں جس کے لیے 2013 میں قطر کے دارالحکومت دوحہ میں طالبان نے سیاسی دفتر قائم کیا تھا تاہم اس میں تیزی اس وقت آئی جب ٹرمپ انتظامیہ نے ستمبر 2019 میں افغانی نژاد زلمے خلیل زاد کو افغان امن عمل کے لیے خصوصی سفیر تعینات کیا تھا۔

معاہدے پر دستخط کی تقریب میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی، اس کے علاوہ لگ بھگ 50 ممالک کے نمائندوں نے بھی اس تقریب میں شرکت کی جبکہ معاہدے پر دستخط کے پیش نظر طالبان کا 31 رکنی وفد بھی قطر کے دارالحکومت میں موجود تھا۔

اس معاہدے کے تحت جنگ زدہ ملک افغانستان میں

امن کا اگلا قدم بین الافغان مذاکرات تھے جس میں براہِ راست افغان حکومت اور طالبان کے درمیان بات چیت ہونی اور اس کی راہ ہموار کرنے اور باہمی اعتماد سازی کے لیے قیدیوں کی تبادلے کی شرط عائد کی گئی تھی۔

امریکا اور طالبان کے درمیان ہونے والے امن معاہدے کے تحت 5 ہزار طالبان قیدیوں کے تبادلے کا وعدہ کیا گیا تھا جس کے بدلے میں طالبان نے ایک ہزار افغان سیکیورٹی فورسز کے قیدیوں کو رہا کرنا تھا۔

تاہم یہ اقدام تاخیر کا شکار ہوا اور اپریل سے اس پر باقاعدہ طور پر رہائی کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے بعد وقفے وقفے سے افغان حکومت اور طالبان کی جانب سے قیدی رہا کیے جاتے رہے تاہم افغان حکام 400 خطرناک طالبان قیدیوں کو رہا کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے جنہیں لویہ جرگے کی منظوری کے بعد بالآخر رہا کر دیا گیا۔

جس کے بعد رواں برس ستمبر میں پہلی مرتبہ افغان حکومت اور طالبان کے نمائندوں کے درمیان قطر کے دارالحکومت دوحہ میں بین الافغان مذاکرات کا آغاز ہوگیا۔

ہیری اور میگھن مارکل کی شاہی حیثیت سے دستبرداری

ہالی وڈ کی چمکتی دمکتی دنیا چھوڑ کر شاہی خاندان میں شامل ہونے والی میگھن مارکل اور ان کے شوہر برطانوی شہزادے پرنس چارلس اور لیڈی ڈیانا کے بیٹے شہزادہ ہیری نے اپنی شاہی حیثیت سے دستبرداری کا اعلان رواں سال کے آغاز میں کیا تھا۔

دونوں نے سن 2020 کے آغاز میں ہی 9 جنوری کو اچانک شاہی ذمہ داریوں سے دستبرداری کا اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا تھا بعد ازاں ملکہ برطانیہ نے بھی دونوں کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی جس کے بعد 19 جنوری کو شاہی محل نے شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل کی شاہی حیثیت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔

برطانوی شاہی محل سے بیان جاری کیا گیا تھا کہ شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل اب شاہی ذمہ داریاں ادا نہیں کریں گے اور نہ ہی وہ اب شاہی محل کا حصہ ہوں گے تاہم ساتھ ہی کہا گیا تھا کہ وہ شاہی خاندان کا حصہ ضرور رہیں گے۔

شاہی خاندان میں پیدا ہونے کے باعث ہیری کو شہزادہ ہی کہا جائے گا مگر ان کی کوئی شاہی حیثیت نہیں ہوگی یعنی اب وہ کسی بھی ملک میں شاہی خاندان کے آفیشل فرد کے طور پر نہیں پہچانے جائیں گے اور اسی طرح وہ اپنی سماجی و کاروباری مصروفیات کے دوران شاہی اعزازات کو بھی استعمال نہیں کر سکیں گے۔

چنانچہ 10 مارچ کو برطانوی شاہی جوڑا شہزادہ ہیری اور ان کی اہلیہ میگھن مارکل باضابطہ طور پر شاہی حیثیت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔

اس سے ایک روز قبل شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل نے بطور شاہی خاندان کے فرد 9 مارچ کو شاہی محل

بچانے کے اس موقع کو ضائع نہ کرے جو اسے آخری ونڈو دیکھتے ہیں۔

نئی دہلی فسادات

بھارت کے مختلف حصوں میں متنازع شہریت قانون کی منظوری کے خلاف 2019 کے اواخر سے مظاہرے جاری تھے اوران مظاہروں نے متعدد مرتبہ پر تشدد صورت اختیار کی اور اس دوران صورتحال خاصی کشیدہ بھی رہی۔

فسادات میں جس پوری مارکیٹ کو جلا کر راکھ کیا گیا وہاں زیادہ تر دکانیں مسلمانوں کی تھیں تاہم رواں برس فروری میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے پہلے بھارتی دورے کے دوران 23 فروری کو بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں جاری مظاہرے اچانک سنگین مذہبی فسادات کی صورت اختیار کر گئے۔ یہاں ہم آپ کو شہریت ترمیمی بل کے بارے میں بتاتے چلیں کہ سال 2019 میں 11 دسمبر کو بھارتی پارلیمنٹ سے شہریت ترمیمی ایکٹ منظور ہوا تھا جس کے تحت 31 دسمبر 2014 سے قبل 3 پڑوسی ممالک سے بھارت آنے والے ہندوؤں، سکھوں، بدھ مت، جینز، پارسیوں اور عیسائیوں کو بھارتی شہریت دی جائے گی جبکہ اس فہرست میں مسلمان شامل نہیں تھے۔

چنانچہ بھارتی دارالحکومت میں ہوئے فسادات کے دوران کم از کم 53 افراد جاں بحق اور 200 سے زائد زخمی ہوئے تھے جن میں سے اکثریت مسلمانوں کی تھی۔

جس کے بارے میں ایک انکشاف یہ بھی سامنے آیا کہ ان فسادات میں دہلی پولیس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو ہدف بنایا تھا۔

ان فسادات میں زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا اور انتہا پسندوں نے مسجد کو بھی نذر آتش کر دیا اس حوالے سے انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ فسادات میں دہلی پولیس انسانی حقوق کی سنگین خلاف پامالی کی مرتکب ہوئی، دہلی پولیس نے مظاہرین پر تشدد کیا اور انہیں گرفتار کیا جبکہ ہندو حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔

ایمنسٹی کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 'ان فسادات میں مسلمانوں کا نقصان ہندوؤں کے مقابلے میں 3 گنا زیادہ تھا، جس میں مسلمانوں کی جائیدادوں اور کاروبار کو بھی نذر آتش کیا گیا تھا'۔

امریکا-طالبان امن معاہدہ

سال 2001 میں نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کے بعد افغانستان میں شروع ہونے والی جنگ کے خاتمے کے لیے امریکا اور طالبان کے درمیان 29 فروری 2020 کو تاریخی امن معاہدے پر دستخط کیے گئے۔

طالبان کے ساتھ امن معاہدے کی باتیں افغان اور امریکی رہنماؤں کی جانب سے گزشتہ ایک دہائی سے کی جارہی تھیں جس کے لیے 2013 میں قطر کے دارالحکومت دوحہ میں طالبان نے سیاسی دفتر قائم کیا تھا تاہم اس میں تیزی اس وقت آئی جب ٹرمپ انتظامیہ نے ستمبر 2019 میں افغانی نژاد زلمے خلیل زاد کو افغان امن عمل کے لیے خصوصی سفیر تعینات کیا تھا۔

معاہدے پر دستخط کی تقریب میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی، اس کے علاوہ لگ بھگ 50 ممالک کے نمائندوں نے بھی اس تقریب میں شرکت کی جبکہ معاہدے پر دستخط کے پیش نظر طالبان کا 31 رکنی وفد بھی قطر کے دارالحکومت میں موجود تھا۔

اس معاہدے کے تحت جنگ زدہ ملک افغانستان میں امن کا اگلا قدم بین الافغان مذاکرات تھے جس میں براہِ راست افغان حکومت اور طالبان کے درمیان بات چیت ہونی اور اس کی راہ ہموار کرنے اور باہمی اعتماد سازی کے لیے قیدیوں کی تبادلے کی شرط عائد کی گئی تھی۔

امریکا اور طالبان کے درمیان ہونے والے امن معاہدے کے تحت 5 ہزار طالبان قیدیوں کے تبادلے کا وعدہ کیا گیا تھا جس کے بدلے میں طالبان نے ایک ہزار افغان سیکیورٹی فورسز کے قیدیوں کو رہا کرنا تھا۔

تاہم یہ اقدام تاخیر کا شکار ہوا اور اپریل سے اس پر باقاعدہ طور پر رہائی کا سلسلہ شروع ہوا، جس کے بعد وقفے وقفے سے افغان حکومت اور طالبان کی جانب سے قیدی رہا کیے جاتے رہے تاہم افغان حکام 400 خطرناک طالبان قیدیوں کو رہا کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے جنہیں لویہ جرگے کی منظوری کے بعد بالآخر رہا کر دیا گیا۔

جس کے بعد رواں برس ستمبر میں پہلی مرتبہ افغان حکومت اور طالبان کے نمائندوں کے درمیان قطر کے دارالحکومت دوحہ میں بین الافغان مذاکرات کا آغاز ہوگیا۔

ہیری اور میگھن مارکل کی شاہی حیثیت سے دستبرداری

ہالی وڈ کی چمکتی دمکتی دنیا چھوڑ کر شاہی خاندان میں شامل ہونے والی میگھن مارکل اور ان کے شوہر برطانوی شہزادے پرنس چارلس اور لیڈی ڈیانا کے بیٹے شہزادہ ہیری نے اپنی شاہی حیثیت سے دستبرداری کا اعلان رواں سال کے آغاز میں کیا تھا۔

دونوں نے سن 2020 کے آغاز میں ہی 9 جنوری کو اچانک شاہی ذمہ داریوں سے دستبرداری کا اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا تھا بعد ازاں ملکہ برطانیہ نے بھی دونوں کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی جس کے بعد 19 جنوری کو شاہی محل نے شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل کی شاہی حیثیت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تھا۔

برطانوی شاہی محل سے بیان جاری کیا گیا تھا کہ شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل اب شاہی ذمہ داریاں ادا نہیں کریں گے اور نہ ہی وہ اب شاہی محل کا حصہ ہوں گے تاہم ساتھ ہی کہا گیا تھا کہ وہ شاہی خاندان کا حصہ ضرور رہیں گے۔

شاہی خاندان میں پیدا ہونے کے باعث ہیری کو شہزادہ ہی کہا جائے گا مگر ان کی کوئی شاہی حیثیت نہیں ہوگی یعنی اب وہ کسی بھی ملک میں شاہی خاندان کے آفیشل فرد کے طور پر نہیں پہچانے جائیں گے اور اسی طرح وہ اپنی سماجی و کاروباری مصروفیات کے دوران شاہی اعزازات کو بھی استعمال نہیں کر سکیں گے۔

چنانچہ 10 مارچ کو برطانوی شاہی جوڑا شہزادہ ہیری اور ان کی اہلیہ میگھن مارکل باضابطہ طور پر شاہی حیثیت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔

اس سے ایک روز قبل شہزادہ ہیری اور میگھن مارکل نے بطور شاہی خاندان کے فرد 9 مارچ کو شاہی محل

میں ہونے والی ایک تقریبات میں شرکت کی جو شاہی حیثیت کے ساتھ ان کی آخری تقریب میں شرکت تھی۔

بعدازاں یہ جوڑا ابتدا میں کینیڈا منتقل ہوا تاہم اس کے بعد دونوں نے امریکا میں سکونت اختیار کرلی، وہ آزادانہ طور پر انٹرٹینمنٹ، فیشن، کھیل اور صحت کے شعبوں میں کام کرکے الگ پہچان بنانے سمیت خود مختار ہونے کے خواہاں ہیں۔

امریکی خام تیل کی قیمتوں میں منفی رجحان

2020 میں جہاں کئی انوکھے اور حیرت انگیز عالمی واقعات نے تاریخ میں اپنی جگہ بنائی وہیں دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کالا سونا کہلائے جانے والے امریکی خام تیل کی قیمتوں میں منفی رجحان دیکھا گیا۔

21 اپریل کو امریکی بینچ مارک ویسٹ ٹیکساس انٹرمیڈیٹ (ڈبلیو ٹی آئی) مئی کی ڈیلیوری کے لیے منفی 37.63 ڈالر فی بیرل کی سطح پر بند ہوا، یعنی خام تیل کے فروخت کنندہ خریدار کو تیل کے ساتھ ساتھ

37.63 ڈالر فی بیرل دینے پر مجبور ہوگئے۔

امریکی خام تیل کی قیمت تاریخ میں پہلی بار منفی ہونے کے بعد وال اسٹریٹ میں بھی شدید مندی دیکھی گئی امریکا کے علاوہ عالمی منڈی میں بھی تیل کی قیمتوں میں کمی اور پیداوار کے حوالے سے سعودی عرب اور روس کے درمیان تنازع نے تیل کی قیمتیں کم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔

جس کے بعد اپریل کا آغاز میں ریاض اور ماسکو نے تیل کی پیداوار ایک کروڑ بیرل فی یوم تک کم کرنے پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے اس تنازع کو ختم کیا تھا۔

تاہم تیل کی قیمتوں میں مزید کمی کا سلسلہ کورونا وائرس کے باعث دنیا کے کئی ممالک میں لگائے لاک ڈاؤن کی وجہ سے جاری رہا جس کے دوران نہ صرف فضائی بلکہ زمینی اور سمندری نقل وحمل کو انتہائی محدود کردیا گیا اور اس کے نتیجے میں تیل کی کھپت میں بھی بڑی کمی ہوئی تھی۔

دنیا کے کئی مقامات پر آتشزدگی

یوں تو سال 2019 سے ہی دنیا کے ایک خطے آسٹریلیا کے جنگلات میں لگی آگ نے وسیع پیمانے پر جنگلی حیات کے لیے تباہ کاریوں کا سلسلہ جاری رہا تاہم سال 2020 میں مزید ایسے آتشزدگی کے واقعات سامنے آئے جس نے بین الاقوامی سطح پر توجہ حاصل کی۔

ایک رپورٹ کے مطابق یہ آگ آسٹریلیا بھر کے جنگلات اور خشک سالی سے متاثرہ زمین کے ایک لاکھ 15 ہزار اسکوائر کلومیٹرز سے زائد (44 ہزار اسکوائر میل) حصے پر لگی تھی جس کے نتیجے میں 30 افراد ہلاک اور ہزاروں گھر تباہ ہوگئے تھے۔

ورلڈ وائڈ فنڈ فار نیچر (ڈبلیو ڈبلیو ایف) کی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی کہ اس غیر معمولی آگ کے نتیجے میں 3 ارب جانور ہلاک ہوئے یا متاثرہ علاقہ چھوڑ گئے اور یہ 'جدید تاریخ میں جنگلی حیات کی بدترین تباہی میں سے ایک ہے'۔

25 اگست کو لبنان کے دارالحکومت بیروت کی بندرگاہ پر خوفناک دھماکے نے کئی میل تک عمارتوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا جس کے نتیجے میں 190 سے زائد افراد ہلاک اور 6 ہزار زخمی ہوگئے تھے۔

ابتدائی طور پر خیال کیا گیا تھا کہ ممکنہ طور پر دھماکا دہشت گردی کی کارروائی ہے تاہم کچھ دن کی تحقیقات سے ثابت ہوا تھا کہ دھماکا گودام میں 6 سال سے پڑے 2 ہزار 700 ٹن نیوامیونیم نائٹریٹ کی وجہ سے ہوا تھا۔

دھماکا اس قدر شدید تھا کہ اس کی آواز پڑوسی قابض ملک اسرائیل کے سرحدی شہر تک سنی گئی تھی جبکہ اس سے ہونے والے نقصانات کے باعث 2 لاکھ 50 افراد بے گھر بھی ہوئے تھے۔

دھماکے کے بعد شہریوں نے حکومت کے خلاف مظاہرے شروع کیے تھے، جس پر اس وقت کے وزیر اعظم حسن دیب نے 11 اگست کو کابینہ سمیت استعفیٰ دے دیا تھا۔

استعفیٰ دینے کے باوجود انہوں نے نگراں وزیر اعظم

کے طور پر کام جاری رکھا اور دھماکے کی تفتیش کے لیے سینئر جج کی سربراہی میں عدالتی کمیشن بھی قائم کیا جس نے تحقیقات کے بعد وزیر اعظم حسین دیب اور تین وزرا پر غلطت کا الزام لگایا، یعنی کہ وہ ہی دھماکے کے ذمہ داران ہیں۔

رپورٹ کے مطابق عدالتی کمیشن کو ایسے شواہد ملے جن سے معلوم ہوا کہ وزیر اعظم حسن دیب کو گودام میں خطرناک مواد کی موجودگی سے آگاہ کیا گیا تھا اور انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کسی وقت بھی بڑا حادثہ ہوسکتا ہے۔ ماہ اگست میں صرف بیروت ہی نہیں بلکہ صرف 4 روز کے دوران مجموعی طور پر دنیا کے 7 ممالک میں آتشزدگی کے واقعات رونما ہوئے تھے۔

جن ممالک میں یہ واقعات پیش آئے ان میں چین، لبنان، فرانس، شمالی کوریا، عراق، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب شامل تھے۔

سانحہ کرائسٹ چرچ کا ٹرائل اور دہشت گرد کو سزا

سال 2019 میں نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ کی مساجد میں فائرنگ کرکے 51 نمازیوں کو قتل کرنے والے دہشت گرد برینٹن ٹیرنٹ کو بغیر پیرول کے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

نیوزی لینڈ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی مجرم کو ایسی سزا سنائی گئی کہ جس میں مجرم کو کسی بھی صورت معافی کا حق نہیں دیا گیا۔

خیال رہے کہ گزشتہ سال 15 مارچ کو نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ میں ایک سفید فام دہشت گرد نے 2 مساجد پر اندھا دھند فائرنگ کرکے متعدد افراد کو شہید اور زخمی کردیا تھا، ساتھ ہی اس پوری کارروائی کو فیس بک لائیو کے ذریعے براہ راست نشر بھی کیا تھا۔

برینٹن ٹیرنٹ کو 51 افراد کے قتل، 40 کے اقدام قتل اور ایک دہشت گردی کے اقدام کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔

جسے سزا دینے کی کارروائی کا آغاز 24 اگست کو ہوا تھا اور 4 روز تک جاری رہنے والی اس کارروائی میں اپنے پیاروں کی جدائی کے کرب سے گزرنے والے لواحقین نے جذباتی انداز میں اپنے بیانات ریکارڈ کروائے تھے۔

جج نے مجرم کو مخاطب کرتے ہوئے اور سزا سناتے ہوئے کہا تھا کہ 'تمہارے جرائم اتنے گھناؤنے ہیں کہ اگر مرنے تک تم کو حراست میں رکھا جائے تو بھی سزا اور مذمت کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جاسکے گا'۔

کارروائی کے دوران استغاثہ نے عدالت کو بتایا تھا

کہ برینٹن ٹیرنٹ ان لوگوں میں خوف پھیلانا چاہتا تھا جن کو وہ خطرہ سمجھتا تھا اور اس نے احتیاط سے منصوبہ بنایا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ قتل عام کرے۔

برینٹن ٹیرنٹ، جس نے سماعت کے دوران اپنی نمائندگی خود کی لیکن کسی قسم کی سفارشات پیش نہیں

کیں، جج نے برینٹن ٹیرنٹ کو سزا سنانے سے قبل پوچھا کہ اگر اسے کچھ کہنا ہے تو اس نے سر ہلا دیا، جب اسے بتایا گیا کہ اسے اپنی بات کہنے کا پورا حق ہے تب بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔

دوسری جانب نیوزی لینڈ کی وزیراعظم جیسنڈا آرڈرن نے فیصلے پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'اسے کبھی سورج کی روشنی نہیں نصیب ہوگی'۔

ان کا کہنا تھا کہ 15' مارچ کا صدمہ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوسکتا لیکن مجھے اُمید ہے کہ آج کا دن وہ آخری دن ہے جس میں ہم اس دہشت گرد کا نام سنیں گا'۔

انہوں نے کہا تھا کہ وہ پوری زندگی کے لیے مکمل خاموشی کا مستحق ہے'۔

کئی مسلمان ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کیا

فلسطین کی حمایت کرنے والے افراد بالخصوص مسلمان رواں برس اگست میں اس وقت حیران رہ گئے جب بااثر عرب ریاست متحدہ عرب امارات (یواے ای) نے اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات معمول پر لانے کے لیے امن معاہدہ کیا۔

نام نہاد 'ابراہام معاہدہ' جو اب اسرائیل اور دیگر خلیجی ریاستوں کے درمیان طویل عرصے سے خفیہ تعلقات کو سامنے لے آیا ہے جس کی بنیاد حالیہ سالوں میں خطے میں موجود مشترکہ حریف ایران کے حوالے سے تشویش پر رکھی گئی تھی۔

اس معاہدہ کے بارے میں اعلان امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کیا، انہوں نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ خطے کے دیگر ممالک بھی یواے ای کے نقش قدم پر چلیں گے اور بعد ازاں ان کا یہ دعویٰ درست بھی ثابت ہوا۔

اس حوالے سے متحدہ عرب امارات نے کہا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ جرات مندانہ اقدام ہے جس سے اسرائیل اور فلسطین کے مابین طویل

عرصے سے جاری تنازع کا حل ممکن ہوسکے گا۔

بعدازاں 29 اگست کو یواے ای نے اپنے قانون میں شامل اسرائیل کے بائیکاٹ سے متعلق شق منسوخ کردی تھی اور دونوں ممالک کے درمیان نہ صرف تعلقات معمول پر آئے بلکہ عوام سطح پر بھی رابطے بڑھانے کے مختلف اقدامات کیے گئے۔

یواے ای کے بعد بحرین وہ چوتھا مسلمان ملک تھا جس نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات بحال کرنے کا اعلان کیا اس سے قبل 1979 میں مصر اور 1994 میں اردن نے اسرائیل سے تعلقات بحال کیے تھے۔

اس کا اعلان کرتے ہوئے امریکی صدر نے ہیرو زبان میں دیئے گئے اپنے پیغام میں کہا تھا کہ میں اسرائیل کے شہریوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس شام ہم ایک اور عرب ریاست سے امن معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ معاہدہ متحدہ عرب امارات سے پہلے ہونے والے امن معاہدے کی روشنی میں تاریخی امن کا موجب بنے گا۔

متحدہ عرب امارات اور بحرین کی جانب سے 15 ستمبر کو باضابطہ طور پر اسرائیل سے تعلقات کی بحالی کے تاریخی معاہدے پر امریکا میں صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی موجودگی میں دستخط کیے گئے۔

یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا بلکہ اس کے بعد ایک اور مسلمان ملک سوڈان نے اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات معمول پر لانے کا اعلان کیا۔

سوڈان کا فیصلہ علامتی طور پر اس لیے بھی اہم تھا کیونکہ 1967 میں اس کے دارالحکومت خرطوم میں ہی عرب لیگ نے اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مزید برآں امریکا کی ثالثی میں مراکش اور اسرائیل نے تعلقات قائم کرنے کے لیے معاہدے پر اتفاق کیا، معاہدے کے تحت مراکش مکمل سفارتی تعلقات اور سرکاری سطح پر اسرائیل کے ساتھ رابطے قائم کرے گا اور فضائی حدود میں پروازوں کی اجازت کے

ساتھ اسرائیل اور تمام اسرائیلیوں کے لیے پروازوں کی اجازت دینا بھی شامل ہوگا۔

بعدازاں اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے والے ممالک کی فہرست میں جنوبی ایشیائی ملک بھوٹان کا بھی اضافہ ہوگیا۔

دونوں ممالک کے درمیان معاہدے پر دستخط کی تقریب بھارت میں اسرائیلی سفارتکار رون مَلکا کے گھر پر منعقد ہوئی۔

امریکی صدارتی انتخاب

سال 2020 جہاں کئی لوگوں کے لیے زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا وہیں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے لیے بھی یہ صدمے کا باعث بنا کے اس میں امریکی اقتدار کا ہما پہلی ہی مدت کے بعد ان کے سر سے اڑ گیا۔

امریکا میں صدارتی انتخاب کے لیے ڈاک کے ذریعے بھی ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور باضابطہ پولنگ کے لیے مقرر دن سے کئی روز پہلے سے اس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، عالمی وبا کے باعث پیدا ہونے والی صورتحال کے باعث امریکی شہریوں کی بہت بڑی تعداد نے ڈاک کے ذریعے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔

امریکی شہریوں کی بہت بڑی تعداد نے ڈاک کے ذریعے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا—تصویر: اے ایف پی

رپورٹس کے مطابق 10 کروڑ 20 لاکھ امریکی شہریوں نے ووٹنگ کے دن سے پہلے ہی اپنا ووٹ دے دیا اس کے باوجود لاکھوں لوگ الیکشن کے روز اپنا حکمران چننے کے لیے قطاروں میں کھڑے نظر آئے۔

ڈاک سے بڑی تعداد میں ووٹنگ کی وجہ سے گنتی میں دیر ہوئی اور انتخابات کے بعد تین روز تک نتائج کے حوالے سے جاری کشمکش اور غیر یقینی کی صورتحال برقرار رہی اس دوران ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے انتخابات میں دھاندلی اور اپنی جیت کے مضحکہ خیز

دعویٰ بھی کیا جاتا رہا۔

تاہم 7 نومبر کی شام ڈیموکریٹ اُمیدوار 78 سالہ جو بائیڈن 270 سے زائد الیکورل ووٹس حاصل کر کے فاتح قرار دے دیے گئے۔

دوسری جانب امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے حسب توقع صدارتی انتخابات میں اپنی شکست تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ڈیموکریٹس پر الیکشن چرانے کے الزامات لگائے اور نہ صرف انہوں نے یہ دعویٰ کیا بلکہ اس سلسلے میں عدالت سے بھی رجوع کیا۔

بعدازاں سپریم کورٹ میں ٹیکساس کے اٹارنی جنرل کین پکسٹن کے ذریعے دائر کردہ قانونی چارہ جوئی میں مطالبہ کیا گیا کہ چار ریاستوں پینسلوینیا، جارجیا، مشی گن اور وسکونسن میں 10 ملین ووٹوں کو کالعدم قرار دیا جائے، ان چاروں ریاستوں میں صدر ٹرمپ ہار گئے تھے، 50 امریکی ریاستوں میں سے 17 اور 120 ری پبلکن قانون سازوں نے بھی اس اقدام کی حمایت کی۔

تاہم امریکی سپریم کورٹ نے 3 نومبر کو ہونے والے انتخابات کے نتائج کو کالعدم قرار دینے کے مقدمے کو

مسترد کرتے ہوئے وائٹ ہاؤس میں رہنے کی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی آخری کوشش کو ناکام بنا دیا۔

جو بائیڈن 20 جنوری کو 46 ویں امریکی صدر کی حیثیت سے حلف اٹھائیں گے

بالآخر 14 دسمبر کو امریکی الیکورل کالج نے جو بائیڈن کو 2020 کے انتخابات میں فاتح قرار دے دیا جس کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ کی مسلسل شکست تسلیم کرنے سے انکار کے باعث 40 دن تک جاری رہنے والے تناؤ کا خاتمہ ہوا۔

امریکی صدر منتخب ہونے کے بعد اب جو بائیڈن 20 جنوری کو ملک کے 46 ویں صدر کی حیثیت سے حلف اٹھائیں گے جس کے بعد اقتدار کا عمل مکمل ہو جائے گا۔

عالمی وبا کورونا وائرس

اب جب ہم اس پورے سال میں عالمی صورتحال پر ایک طائرانہ نظر ڈال رہے ہیں ایسے میں سب سے نمایاں اور وسیع ترین مضمون کورونا وائرس ہی ہے جس کا ذکر کیے بغیر اس سال کو ضبطِ تحریر لانا ممکن ہی نہیں۔

یہ وائرس سال 2019 کے آخر میں چین میں نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں پھیل گیا، مارچ تک اس وائرس سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک اٹلی تھا لیکن اس کے بعد اس وبا نے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک امریکا کو ایسا جکڑا کہ وہ اب تک سنبھل نہیں پایا۔

اکثر ممالک سے وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے لوگوں کے رابطے کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی وائرس

کا آغاز کہاں سے ہوا اس کے بارے میں اب تک کا اندازہ یہی ہے کہ یہ جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہوا اس کا پھیلاؤ کا ذمہ دار پہلے چمگادڑوں اور پھر پینگولن نامی جانور کو قرار دیا جاتا رہا تاہم ابھی تک ٹھوس بنیاد پر اس بات کی تصدیق سامنے نہیں آسکی کہ کیا یہ جانوروں سے ہی انسانوں میں منتقل ہوا یا اس کے پیچھے کوئی اور راز ہے۔

اس حوالے سے چین اور امریکا کے درمیان لفظی جنگ بھی دیکھنے میں آئی اور امریکا نے واضح الفاظ میں الزام عائد کیا کہ وائرس چین کے شہر ووہان کی لیبارٹری میں تیار کیا گیا اور ساتھ ہی چین میں بائیو ٹیکنالوجی کی حساس لیبارٹریز کا معائنہ کرنے کا بھی مطالبہ بھی سامنے آتا رہا۔

جہاں امریکا نے کورونا وائرس کو چینی وبا قرار دیا، وہیں چین نے بھی امریکا پر الزام لگایا کہ دراصل امریکی فوج ہی ابتدائی طور پر کورونا کو ان کے شہر ووہان لے کر آئی تھی مگر ایسے الزامات کو ثابت نہیں کیا جاسکا اور یہ سب صرف بیانات اور میڈیا کی خبروں کی زینت تک محدود رہے۔

آغاز میں اکثر ممالک نے وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے لوگوں کے رابطے کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے لاک ڈاؤن لگایا گیا جس میں انتہائی ضروری سہولیات کے علاوہ ہر قسم کے کاروباری، سماجی، تفریحی، مذہبی مراکز بند کردیے گئے۔

تاہم وائرس کے پھیلاؤ میں سستی آنے اور معاشی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک بھی لاک ڈاؤن کا خاتمہ کرنے اور معیشت کے پہیے کو دوبارہ رواں کرنے پر مجبور ہوئے، وبا کا پھیلاؤ سست ضرور ہوا لیکن تھما نہیں۔

چنانچہ موسم سرما کے آغاز کے ساتھ وائرس نے دوسری لہر کی صورت میں ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا اور اب دوبارہ اکثر ممالک میں جزوی اور کہیں کہیں مکمل لاک ڈاؤن لگایا جاچکا ہے۔

تاہم حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ دنیا میں کورونا ویکسین کی باقاعدہ منظوری دی جاچکی ہے اور کئی ممالک میں ویکسین لگانے کا سلسلہ بھی جاری ہے، لیکن پوری دنیا کو ویکسین ملنے میں سال کے آخری عشرے تک یہ وبا 7 کروڑ 70 سے زائد افراد کو صدقِ طور پر اپنا شکار بنا چکی تھی جس میں سے 4 کروڑ 34 لاکھ سے زائد صحتیاب ہونے میں کامیاب رہے جبکہ تقریباً 17 لاکھ اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔

اس ضمن میں تازہ ترین پیش رفت یہ سامنے آئی کہ برطانیہ میں کورونا وائرس کی نئی قسم سامنے آئی ہے، یہ نئی قسم دسمبر کے وسط میں برطانیہ میں دریافت ہوئی تھی اور 19 دسمبر کو عالمی ادارہ صحت کو آگاہ کیا گیا تھا کہ کورونا وائرس کی یہ نئی قسم دیگر کے مقابلے میں زیادہ تیزی سے پھیل رہی ہے۔

دوسری جانب دنیا کے متعدد ممالک نے برطانیہ کے سفر پر پابندی عائد کردی تاکہ انگلینڈ کے جنوبی حصے میں سامنے آنے والے کورونا وائرس کی ایک نئی قسم کو براعظم میں پھیلاؤ سے روکا جاسکے۔

علاوہ ازیں برطانوی وزیراعظم بورس جانسن نے فوری طور پر لاکھوں افراد کے کرسمس کے منصوبوں کو ختم کرتے ہوئے سخت پابندیاں نافذ کردیں۔

☆☆☆

دنیا بھر میں 2020 میں 50 صحافیوں کو قتل کیا گیا، آر ایس ایف

رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز (آر ایس ایف) کے مطابق 2020 میں 50 صحافی اور میڈیا کارکنوں کو ان کے کام کی بنیاد پر قتل کیا گیا۔

غیر ملکی خبر رساں ادارے 'اے ایف پی' کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا کہ بیشتر صحافیوں اور میڈیا کارکنوں کو ایسے خطوں میں قتل کیا گیا جہاں جنگ نہیں چل رہی تھی۔

نگران تنظیم نے بتایا کہ یہ اعداد و شمار منظم جرائم، بدعنوانی یا ماحولیاتی امور کی تحقیقات کرنے والے نامہ نگاروں کو ہدف بنانے میں اضافہ ظاہر کرتا ہے۔

آر ایس ایف کی رپورٹ میں میکسیکو، بھارت اور پاکستان میں صحافیوں کے قتل پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔

رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا کہ 2019 میں 63 فیصد کے مقابلے میں امسال ہلاک ہونے والوں میں سے 68 فیصد کو اپنے کام کی وجہ 'جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا'۔

آر ایس ایف کے چیف ایڈیٹر پاولین اڈیس میول نے کہا کہ 'کئی برسوں سے رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز نے یہ بات نوٹ کی ہے کہ تحقیقی صحافی ریاستوں یا کارٹیلز کی کارروائی کا ہدف بنتے ہیں'۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ میکسیکو سب سے خطرناک ملک تھا جہاں 8 صحافی یا میڈیا ورکرز کو نشانہ بنایا گیا۔

رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز کی رپورٹ میں کہا گیا کہ 'منشیات اسمگلروں اور سیاستدانوں کے مابین روابط باقی ہیں اور جو صحافی ان سے متعلقہ معاملات سے پردہ ہٹانے کی ہمت کرتے ہیں انہیں قتل کر دیا جاتا ہے'۔

آر ایس ایف نے مزید کہا کہ 1995 سے میکسیکو کے کسی بھی قاتل کو ابھی تک سزا نہیں دی گئی ہے۔

آر ایس ایف نے حکومت اور طالبان کے مابین امن مذاکرات کے تناظر میں کہا کہ حالیہ مہینوں میں میڈیا کارکنوں پر حملوں میں اضافہ ہوا ہے۔

رپورٹرز وِد آؤٹ بارڈرز کی رپورٹ میں ایرانی حزب اختلاف کے رہنما روح اللہ زام کے معاملے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

خیال رہے کہ روح اللہ زام نے سوشل میڈیا چینل چلایا تھا جس میں حکومت کے خلاف مخالفین کو بھڑکانے کا الزام تھا اور انہیں دسمبر میں پھانسی دی گئی تھی۔

رپورٹ میں کہا گیا کہ 'پھانسی سے ایران ایک ایسے ملک کی حیثیت سے نمایاں ہوا جس نے گزشتہ نصف صدی میں باضابطہ طور پر سب سے زیادہ صحافیوں کو موت کے گھاٹ اتارا'۔

کورونا وائرس کی رپورٹنگ پر چینی صحافی کو 4 سال قید

چینی شہری صحافی کو ووڈ-19 کی وبا کے آغاز کے بعد ووہان میں رپورٹنگ پر 4 سال قید کی سزا سنا دی گئی۔

ان کے وکیل نے کہا کہ چین کے وسطی شہر میں 'نامعلوم وائرل نمونیا' کی تفصیلات منظر عام پر آنے کے تقریباً ایک سال بعد ان کی مؤکلہ کو سزا سنائی گئی۔

اخبار میں شائع فرانسیسی خبر رساں ادارے کی رپورٹ کے مطابق سابق وکیل زانگ زین گزشتہ روز وہیل چیئر پر عدالت میں پیش ہوئی تھیں جہاں شنگھائی کی عدالت نے مختصر سماعت میں انہیں وبا کے پھیلاؤ کے افراتفری پر مبنی ابتدائی مراحل میں جھگڑا کرنے اور اشتعال دلانے کے الزام میں سزا سنائی۔

ان کی لائیو رپورٹس اور مضامین فروری میں سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر شیئر ہوئے تھے، جنہوں نے حکام کی توجہ حاصل کی تھی۔

چینی حکام کی جانب سے 8 وائرس وسل بلوورز کو وبا سے متعلق حکومتی ردعمل پر تنقید کو روکنے کے لیے سزا سنائی جا چکی ہے۔

بیجنگ کی جانب سے اپنی سرحدوں میں وائرس پر قابو پانے میں 'غیر معمولی' کامیابی پر خود کو مبارکباد دی جاتی ہے، جس کی معیشت بھی بہتری کی جانب گامزن ہے جبکہ دنیا کے بیشتر ممالک ووہان میں عالمی وبا کے آغاز سے اب تک لاک ڈاؤن اور بڑھتے ہوئے کیسز کا سامنا کر رہے ہیں۔

غیر معمولی عالمی صحت کے بحران کے دوران چین نے معلومات کے بہاؤ کو کنٹرول کر کے بیانیے کو اپنے حق میں کیا اور ملک کی حکمراں جماعت کی جانب سے صدر شی جن پنگ کو سراہا گیا۔

تاہم ان کے سرکاری بیانیے پر تنقید کرنے والوں کو سنگین مشکلات کا سامنا ہے۔

عدالت نے کہا کہ زانگ زین نے آن لائن 'جھوٹے بیان' جاری کیے، ان کے وکیل زانگ کیکے کے مطابق پراسیکیوشن نے شواہد پوری طرح سے نہیں دیکھے۔

ان کے وکیل نے کہا کہ ہمیں سمجھ نہیں آیا کہ اصل میں زانگ زین پر کیا کرنے کا الزام عائد کیا گیا، انہوں نے کیس کی سماعت کو تیز رفتار قرار دیا۔

دوسری جانب مدعی علیہ نے سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا، جب جج نے ان سے اپنی شناخت کی تصدیق کا کہا تو بھی انہوں نے جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔

زانگ زین کی دفاعی ٹیم کے ایک اور رکن کی جانب سے بتایا گیا کہ جب فیصلہ پڑھا گیا کہ تو ان کی والدہ رو پڑیں۔

دوسری جانب زانگ زین کی صحت پر تحفظات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے، جنہوں نے جون میں بھوک ہڑتال شروع کی تھی اور اب انہیں ناک کے ذریعے زبردستی خوراک دی جا رہی ہے۔

ان کی لیگل ٹیم کا کہنا تھا کہ زانگ زین کی صحت گر رہی ہے اور انہیں سر درد، چکر اور معدے میں درد کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے وہ عدالت میں وہیل چیئر پر پیش ہوئیں۔

انہوں نے کہا کہ گزشتہ ہفتے جب زانگ زین سے ملاقات ہوئی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر وہ مجھے سخت سزا سناتے ہیں تو میں آخر تک کھانے سے انکار کر دوں گی، ان کا خیال ہے کہ وہ قید میں مر جائیں گی۔

زانگ زین نے ووہان کے ابتدائی ردعمل پر تنقید کی تھی، فروری میں انہوں نے مضمون لکھا تھا کہ حکومت نے لوگوں کو زیادہ معلومات نہیں دیں اور شہر کو لاک ڈاؤن کر دیا۔

انہوں نے لکھا تھا کہ یہ انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں اور کچھ سفارت خانوں کی جانب سے اس کیس پر توجہ مرکوز کی گئی تاہم کئی ممالک کے سفیروں کی جانب سے سماعت کی نگرانی کی درخواست مسترد کی گئی تھی۔

2021ء مسلم دنیا کے لیے فیصلہ کن سال

آصف شاہد

2020ء میں کورونا وائرس کی وبا نے دنیا کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا ہے۔ سماجی میل جول ختم ہوگیا، سفری پابندیاں لگیں اور معاشرہ یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا۔

وائرس کے خوف نے جہاں انسانوں کو ایک دوسرے سے دُوری اختیار کرنے پر مجبور کیا وہیں اس سال کچھ سخت حریف یوں قریب آئے کہ لگتا تھا کہ بچھڑے ہوئے ایک عرصے بعد ملے ہوں۔ یہ قربت 'معاہدات ابراہیمی' کے نام پر ہوئی اور انجیل کے تصورات کو ان معاہدوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ معاہدات ابراہیمی نے مسلم دنیا میں ایسی ہلچل پیدا کی ہے کہ اس کے اثرات کئی عشروں یا شاید صدیوں تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

اسرائیل سے تعلقات کے قیام اور تجدید تعلقات کے لیے 5 مسلم، عرب ممالک نے براستہ وائٹ ہاؤس معاہدات ابراہیمی کو اپنایا۔ ان معاہدات ابراہیمی کے لیے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور ان کی اسرائیل نواز ٹیم نے جان توڑ محنت کی۔

صدر ٹرمپ ان معاہدات ابراہیمی کی بنیاد پر دوسری مدت صدارت کا خواب سجائے بیٹھے تھے لیکن یہ خواب چکنا چور ہوگیا۔ امریکی انتخابات میں فراڈ کے الزامات کی گونج اس قدر شدید تھی کہ لگتا تھا تیسری دنیا کے کسی ملک کے الیکشن میں دھاندلی ہوگئی ہے اور دنیا میں جمہوریت کا چیمپئن امریکا بہادران انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کردے گا اور اس ملک کا معاشی و سماجی بائیکاٹ تب تک جاری رہے گا جب تک وہ ملک ان انتخابات کو کالعدم قرار نہیں دے دیتا، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ یہ امریکا کا اندرونی معاملہ تھا۔

معاہدات ابراہیمی واقعی ایسی بڑی پیشرفت تھی جس پر امریکی صدر کا دوسری مدت کے لیے منتخب ہونا لازم تھا لیکن بُرا ہو کورونا وائرس کا جس کی وجہ سے امریکی معیشت سخت بحران کا شکار ہوئی۔ کروڑوں امریکی بیروزگاری کے طوفان کی زد میں آئے، معاشی مشکلات نے سماجی تضادات کو بھی آشکار کیا اور صدر ٹرمپ کا خارجہ پالیسی کی بنیاد پر الیکشن جیتنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔

20 جنوری کو امریکا میں انتقالِ اقتدار ہونا ہے لیکن ٹرمپ اب بھی دھاندلی کا رونا رو رہے ہیں اور وائٹ ہاؤس میں انتخابی نتائج کو الٹانے کے منصوبے اب بھی زیرِ بحث ہیں۔ صدر ٹرمپ کے سابق مشیر برائے قومی سلامتی جنرل مائیکل فلن سمیت کئی سخت گیر ری پبلکن مارشل لا کے نفاذ اور ووٹنگ مشینوں کو قبضے میں لے کر سوئنگ ریاستوں میں دوبارہ انتخابات کے مشورے دے رہے ہیں۔ ٹرمپ کے مشیران نے انتخابی نتائج الٹانے کے جتنے بھی نسخے تجویز کیے ہیں وہ قابلِ عمل نظر نہیں آتے اور انتقالِ اقتدار یقینی ہے۔

صدر ٹرمپ 20 جنوری کو وائٹ ہاؤس سے رخصت ہوجائیں گے لیکن جاتے ہوئے وہ نئی بائیڈن انتظامیہ اور دنیا کے لیے کئی مسائل کھڑے کر کے جا رہے ہیں۔ اگر ٹرمپ انتظامیہ کو دوسری مدت مل جاتی تو شاید وہ ان مسائل کو کوئی رخ دے جاتے لیکن اب معاہدات ابراہیمی، افغان امن عمل اور عراق اور شام سے امریکی انخلا کے معاملات پر بائیڈن انتظامیہ کی رائے مختلف ہوسکتی ہے جو معاملات کو مزید الجھانے کا سبب بنے گی۔

گزشتہ 100 سال میں مشرقِ وسطیٰ نے ناقابلِ یقین تبدیلیاں دیکھیں جن میں سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ، یورپ کا تسلط، اسرائیل کا قیام اور جنگیں، عرب قوم پرستی اور سوشل ازم کے تجربات، امریکی عالمی میں اسرائیل، فلسطین امن کا خواب اور اس کے نتیجے میں ملنے والے دھوکے، انقلابِ ایران، عراق پر حملے کے بعد خطے میں امریکا کا زوال، عرب بہار، داعش کا قیام اور اس کے نتیجے میں ہونے والی بربادی اور ایران کے ساتھ مغرب کے اتحادی عربوں کی صلح کی ناکام کوششیں شامل ہیں۔

گزشتہ 100 سال میں مسلم دنیا نے ناقابلِ یقین تبدیلیاں دیکھی ہیں

نئی صدی میں معاہدات ابراہیمی کے بعد مشرقِ وسطیٰ

میں اسرائیل کا اثر و رسوخ جسے اسرائیلی تسلط سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، سب سے اہم عنصر ہے۔ اس کے علاوہ 5 عرب ممالک شام، لیبیا، عراق، لبنان اور یمن خانہ جنگی کا شکار ہیں اور سیاسی طور پر مفلوج یا ناکام ریاست بننے کی طرف بڑھ رہے ہیں، جبکہ ترکی کی پالیسیوں کو خلافتِ عثمانیہ کے احیا کی کوششوں کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ بحیرہ روم میں ترکی کی پالیسیوں کو نیٹو کا رکن ہونے کے باوجود یورپی اتحاد کے خلاف نئی طاقت شمار کیا جا رہا ہے جو نیٹو کے اصل حریف روس کے قریب ہے اور مشرق وسطیٰ میں روس کی پیش قدمی بھی جاری ہے۔ دوسری جانب چین خطے میں بڑے کھلاڑی کی حیثیت سے قدم جما رہا ہے۔

ترکی جنوب مشرق اور جنوب مغرب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا ہے۔ شام، عراق اور لیبیا میں ترکی کی مداخلت اور نگورنو-کاراباخ میں ترکی کی مدد سے آذربائیجان کی فتح دراصل ترکی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے مظاہر ہیں۔ عربوں کے سماجی بائیکاٹ کی زد میں آئے قطر کے ساتھ ترکی کی گرم جوشی اسے مشرق وسطیٰ کا اہم کھلاڑی بنا چکی ہے، جبکہ نیٹو کے ساتھ بڑھتے ہوئے تناؤ میں ترکی روس کے ساتھ شراکت کو بڑھا رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے 3 بڑے ملکوں سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مصر کے ساتھ بھی ترکی کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے۔

معاشی پابندیوں کے بوجھ تلے دبا ایران اپنی تنہائی کے باوجود بغداد اور دمشق کے راستے بیروت تک اثر و رسوخ قائم رکھے ہوئے ہے۔ مصر، اردن اور خلیج تعاون تنظیم کے چند رکن ممالک اسرائیل کے ساتھ مل کر صف بندی کر رہے ہیں اور اسرائیل کی فوجی، سیاسی اور انٹیلی جنس صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ معاہدات ابراہیمی کو مزید فروغ دینے پر کام جاری ہے، مزید 2 مسلم ممالک، جن میں ایک عرب اور ایک ایشیائی مسلم طاقت شامل ہے، جلد اس دائرے میں داخل ہو سکتے ہیں جس کے بعد سعودی عرب بھی معاہدہ ابراہیمی قبول کرنے والا ملک بن سکتا ہے۔

معاہدات ابراہیمی کے بعد اب عرب-اسرائیل اتحاد بنتا نظر آ رہا ہے

معاہدات ابراہیمی کی صورت میں اسرائیل عرب اتحاد تشکیل پا رہا ہے جس کی بنیاد سلامتی کو درپیش خطرات پر ہے۔ اسرائیل اور عربوں کے لیے 2 ہی خطرات ہیں، پہلا ایران اور اس کے اتحادی اور دوسرا سیاسی اسلام جس کی ایک شکل اخوان المسلمون ہے۔ ترکی اور قطر کے ساتھ عربوں کا بنیادی جھگڑا ہی اخوان المسلمون کی حمایت اور مدد پر ہے۔ ایران کا جوہری پروگرام اب خطرہ شمار نہیں ہو رہا بلکہ میزائل اور ڈرونز سمیت ایران اور اس کے اتحادیوں کی روایتی فوجی صلاحیتیں خطرہ شمار کی جا رہی ہیں۔

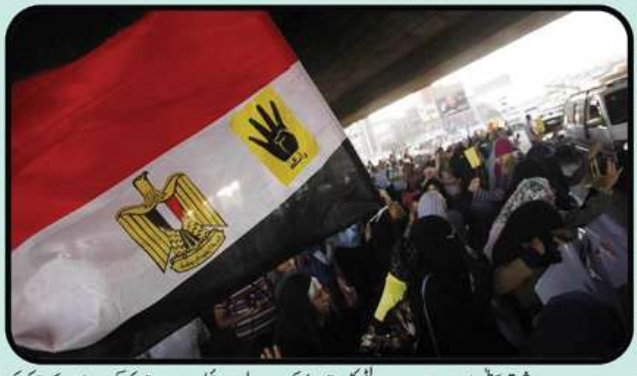

مشرق وسطیٰ میں اب 3 بڑے جیو پولیٹیکل اتحاد ابھر کر سامنے آئے ہیں، ایک ترکی اور اس کے اتحادی، دوسرا ایران اور اس کے اتحادی اور تیسرا عرب-اسرائیل اتحاد۔

ترکی اور اس کے اتحادی عرب دنیا میں اخوان المسلمون کو بادشاہتوں اور آمریتوں کے لیے دردِ سر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ عرب بادشاہتوں نے اخوان المسلمون کو کالعدم دہشتگرد تنظیم قرار دے دیا ہے۔ نام نہاد عرب جمہوریتوں میں بھی اخوان المسلمون اشرافیہ کے لیے خطرہ ہے۔ عرب دنیا کی بادشاہتیں اور نام نہاد آمریتیں سابق صدر مرسی کی طرح کہیں بھی اخوان کے دوبارہ نمودار ہونے اور اس کے باقی ملکوں میں اثرات کو کسی بھی صورت روکنا چاہتے ہیں۔ عرب بہار کے 10 سال مکمل ہونے کے بعد بھی دوبارہ کسی سیاسی تحریک کا خطرہ ابھی تک صرف دبایا ہی جا سکا ہے، ختم نہیں ہوا ہے۔ عرب ریاستیں محمد مرسی کی طرح کہیں اور اخوان کو نمودار ہونے سے روکنا چاہتی ہیں

عرب بادشاہتیں اب اسرائیل کی سکیورٹی اور ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانے کی خواہاں ہیں اور اضافی فائدہ اسرائیل کا وائٹ ہاؤس میں اثر و رسوخ ہے۔ انتظامیہ کوئی بھی ہو اسرائیل وائٹ ہاؤس کے لیے ہمیشہ اہم رہا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ میں اسرائیل کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی تھی لیکن بائیڈن انتظامیہ بھی اسرائیل کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

عرب-اسرائیل اتحاد کو بائیڈن انتظامیہ کے حوالے سے کچھ خدشات ہو سکتے ہیں لیکن ترکی کے حوالے سے بائیڈن کا موقف ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اسی لیے اسرائیل-عرب اتحاد کو کچھ حوصلہ ہے کہ ترکی کی مخالفت میں انہیں بائیڈن انتظامیہ سے رعایتیں مل سکتی ہیں۔ البتہ اخوان کے حوالے سے بائیڈن انتظامیہ کا رویہ مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ عرب بہار بھی اوباما انتظامیہ کی 'پیشکش' تھی اور بائیڈن انتظامیہ میں اوباما کے بہت سے ارکان شامل ہیں۔

اخوان کے حوالے سے بائیڈن کا رویہ مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ عرب بہار دراصل اوباما انتظامیہ کی پیشکش تھی

عرب-اسرائیل اتحاد کو بائیڈن انتظامیہ کے حوالے سے سب سے بڑا خدشہ ایران پالیسی پر ہے اور اگر بائیڈن انتظامیہ ایرانی جوہری پروگرام پر بین الاقوامی معاہدے میں دوبارہ شامل ہو جاتی ہے تو یہ عرب-اسرائیل اتحاد کے لیے بڑا دھچکا ہوگا۔ بائیڈن کی ایران پالیسی کسی بھی غیر متوقع واقعے یا اشتعال انگیزی میں بدل سکتی ہے اور سینیٹ پر کنٹرول کی کشمکش بھی اس پالیسی پر اثر انداز ہوگی۔ امریکی سینیٹ میں اکثریت کا فیصلہ جارجیا میں ہونے والے رن آف کے نتیجے پر لٹکا ہوا ہے۔

غیر متوقع حالات یا اشتعال انگیزی سے بائیڈن انتظامیہ کی پالیسی بدلوانے کی کوشش انتقالِ اقتدار سے پہلے شروع ہو چکی ہے۔ ایرانی جوہری پروگرام کے خالق محسن فخری زادے کا قتل ایسی ہی کوشش تھی۔ ایران اس کوشش کو سمجھتا ہے اسی لیے ایران کی طرف سے ردِعمل نرم تھا۔ امریکی سینٹرل کمانڈ مشرق وسطیٰ میں بی 52 طیارے اور ایف 35 کا اسکواڈرن لا کر کسی بھی غیر متوقع ردِعمل کے لیے تیار رہی لیکن ایران سخت ردِعمل سے گریزاں ہے اور انتقالِ اقتدار کا منتظر ہے۔ اب بھی ٹرمپ انتظامیہ آخری 2 ہفتوں میں اسرائیل کو استعمال کر کے خطے میں جنگ چھیڑنے کی کوشش کر سکتی ہے۔

سعودی شہر نیوم میں اسرائیل اور اعلیٰ سعودی قیادت کے مذاکرات بھی بائیڈن انتظامیہ کے لیے ایک پیغام تھے کہ واشنگٹن کے اتحادی اب نئی صف بندی کر رہے ہیں۔ سعودی عرب اور اسرائیلی قیادت کی ملاقات کی خبر سوچ سمجھ کر لیک کی گئی جس کے لیے ریاض نے رضامندی ظاہر کی تھی، اسی لیے اس لیک پر ریاض نے برا نہیں منایا۔

اسرائیل اور سعودی عرب میں تعلقات کا قیام شاہ سلمان کی زندگی میں ممکن نہیں اور اسرائیل اس بات کو سمجھتا ہے اسی لیے زیادہ بے چینی نہیں دکھائی جا رہی اور خفیہ طور پر دونوں ملک انٹیلی جنس سمیت کئی شعبوں میں تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسرائیل سے تعلقات کا قیام ایسا سوال ہے جس نے سعودی شاہی خاندان کی اندرونی کشمکش کو دنیا کے سامنے اجاگر کر دیا ہے۔

معاہدات ابراہیمی کے بعد منامہ میں ہونے والے سیکیورٹی ڈائیلاگ میں شہزادہ ترکی الفیصل نے اسرائیل کو مغرب کی نوآبادیاتی طاقت قرار دیا جو فلسطینیوں کو حراستی کیمپوں میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنا رہی ہے اور جسے چاہتی ہے قتل کر دیتی ہے۔ سعودی شاہی خاندان کے اندر سے اٹھنے والی اس آواز نے اسرائیل کو ششدر کر دیا اور منامہ ڈائیلاگ میں سعودی شہزادے کے بعد خطاب کے لیے آنے والے اسرائیلی وزیر دفاع کو وضاحت کرنا پڑی کہ شہزادہ ترکی نے معاہدہ ابراہیمی سے ہٹ کر جذبات کا اظہار کیا۔

ترکی الفیصل کی یہ آواز اس لیے بھی اہم ہے کہ وہ برسوں مغرب میں سعودی سفیر رہے اور کئی مواقع پر اسرائیلیوں کے ساتھ سعودی روابط کا ذریعہ بنے۔ ایک اور آواز جو اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے حق میں ہے وہ شہزادہ بندر بن سلطان کی ہے۔ ترکی الفیصل اور بندر بن سلطان دراصل سعودی شاہی خاندان میں دو گروپوں کی نمائندہ آوازیں ہیں اور سعودی شاہی خاندان اس وقت اندرونی کشمکش کے حالات میں بڑا فیصلہ نہیں کر پائے گا اسی لیے مسلم دنیا کے دوسرے بڑے ملکوں پر دباؤ بڑھایا جا رہا ہے کہ وہ پہل کریں۔

عرب دنیا کی طرف سے دباؤ پاکستان بھی برداشت کر رہا ہے۔ اس دباؤ کی واضح نشانیاں متحدہ عرب امارات کی طرف سے پاکستانیوں کے لیے ویزے بند کرنا اور بھارتی آرمی چیف کا عرب امارات اور سعودی عرب کا دورہ ہے۔

پاکستان میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے ایک سوچ موجود رہی ہے۔ سابق صدر پرویز مشرف کے دور میں اس پر کام بھی ہوا اور سابق وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے ترکی میں اسرائیلی حکام سے ملاقاتیں بھی کیں جس کا وہ اعتراف بھی کرتے ہیں۔ خورشید قصوری اور سابق اسرائیلی وزیر خارجہ سیلون شیلوم کی 2005ء میں استنبول میں ہونے والی ملاقات — تصویر اے پی

پاکستان میں ایک بار پھر اس سوچ کے حامی سرگرم ہیں اور رائے عامہ بنانے کے لیے پہلی بار کھلی بحث چھیڑی گئی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرے پر الزامات بھی لگائے جا رہے ہیں کہ کون اسرائیل کا پرانا دوست ہے۔ جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا اجمل قادری کو میدان میں اتارا گیا ہے تاکہ 2 بڑی جماعتیں جو اس وقت اپوزیشن میں ہیں انہیں دباؤ میں لایا جا سکے اور کوئی مخالفت برقرار نہ رہے یا پھر مخالفت کرنے والوں کی اپنی ساکھ اس معاملے میں اس قدر مجروح کر دی جائے کہ ان کی بات پُراثر نہ رہے۔ اجمل قادری نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سابق وزیراعظم نواز شریف کے دور میں ایک وفد نے اسرائیلی حکام سے ملاقات کی تھی اور وہ بھی اس وفد کا حصہ تھے۔

پاکستان میں اسرائیل کے حوالے سے اثرات کی سیاست ملک کو کوئی فائدہ نہیں دے گی بلکہ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان اپنے روایتی عرب دوستوں کے ساتھ تعلقات کو خراب ہونے سے بچائے اور انہیں بھارتی پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے سے روکنے کی کوشش کرے۔ 70 برسوں میں کسی بھی بھارتی آرمی چیف کا دورہ سعودی عرب اور ریاض–دہلی سیکیورٹی تعاون کے امکانات پاکستان کی سلامتی کے لیے چھوٹا خطرہ نہیں۔

سعودی شاہی خاندان اگر اپنے اقتدار کے لیے پاکستان کو قربانی پر مجبور کر رہا ہے تو پاکستان کو اپنی سلامتی اور خودمختاری پر سمجھوتہ کیے بغیر سفارتی سطح پر کوئی راہ نکالنا ہوگی۔ امارات اور سعودی عرب کے ساتھ تعلقات میں خرابی پہلے سے مشکلات کی شکار معیشت کو بڑے نقصانات سے دوچار کر دے گی۔

پاکستان سعودی عرب کی طرف سے اسٹیٹ بینک میں رکھوائے گئے 2 ارب ڈالر واپس کر چکا ہے اور مزید ایک ارب ڈالر اگلے سال کے آغاز پر واپس کرنے کا پابند ہے۔ ان حالات میں اندرونی سیاست میں کوئی بھونچال مزید خرابی کا باعث بنے گا اور الزامات کی سیاست کا تسلسل کوتاہ بینی کے سوا کچھ نہیں۔ ابھی جس ایشیائی مسلم ملک کے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات ہو رہی ہے اس میں پاکستان کے علاوہ دوسرا ممکنہ نام انڈونیشیا کا ہے جو مسلم دنیا میں آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا ملک ہے۔ پاکستان میں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حامی ایک مہم چلا رہے ہیں لیکن کسی کے پاس بھی قابل عمل تجویز نہیں کہ پاکستان کو اتنے بڑے سفارتی ایڈونچر سے کیا ملے گا؟

جیسے عرب امارات نے اس سفارتی ایڈونچر کے ذریعے ایف 35 طیاروں اور ڈرونز تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ اسرائیل کی ٹیکنالوجی تک بھی اس کی رسائی ہو چکی ہے اور مستقبل میں مشترکہ دفاعی پیداوار کے منصوبے بن رہے ہیں۔

عرب امارات نے اسرائیل کو تسلیم کر کے ایف 35 طیاروں اور ڈرونز تک رسائی حاصل کر لی ہے

سوڈان نے دہشتگرد ملکوں کی فہرست سے نام نکلوا لیا ہے، معاشی پابندیوں سے نجات پائی ہے اور سب سے بڑھ کر مغربی صحارا پر خودمختاری تسلیم کرا لی ہے۔ کیا پاکستان کے پاس کوئی آپشن ہے؟ کیا اسرائیل جو بھارت کا دفاعی پارٹنر ہے وہ پاکستان کو ٹیکنالوجی تک رسائی دے گا؟ کیا امریکا بھارت کو ناراض کر کے پاکستان کے ساتھ دفاعی شراکت بڑھائے گا؟ کیا سوڈان کی طرح پاکستان متنازع علاقوں پر خودمختاری تسلیم کروا پائے گا؟ کیا سوڈان کی طرح پاکستان کو قرض ریلیف دیا جائے گا؟ یہ ہیں وہ سوالات جن پر غور اور مباحثے کی ضرورت ہے لیکن قومی سیاسی قیادت کا رویہ محلے کی پچھلی گلی جیسا ہے جو خود پر بدکرداری کے الزامات کی صفائی نہیں دیتی بلکہ جواب میں دوسروں پر بدکرداری کے الزامات لگاتی ہے۔

اسرائیل کے ساتھ معاہدات ابراہیمی کے دائرے میں آنے والے مسلم ممالک کے لیے فلسطینی ریاست سے بھی بڑا سوال قبلہ اول کو لاحق خطرات ہیں۔ امریکا، اسرائیل اور عرب امارات کے مشترکہ بیان کو ایک بار پھر غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

اس مشترکہ بیان میں کہا گیا کہ اسرائیل۔ فلسطین تنازع کے منصفانہ، جامع اور پائیدار حل کے لیے عرب امارات اور اسرائیل اپنی کوششیں جاری رکھیں گے، امن سے آنے والے تمام مسلمان مسجد اقصیٰ اور یروشلم کے تمام مذہبی مقامات پر عبادت کر سکیں گے اور تمام مذاہب کے پُرامن عبادت گزاروں کے لیے تمام مقامات کھلے رہیں گے۔

مشترکہ بیان کی یہ سطور واضح کرتی ہیں کہ مسجد اقصیٰ تمام مذاہب کے لیے کھولی جائے گی اور مسلح یہودی آبادکار اور اسرائیلی فوجی جو پہلے ہی آئے روز مسجد اقصیٰ میں زبردستی گھسنے کی کوشش کرتے ہیں، اس مشترکہ بیان نے ان کی اس دراندازی کو جائز قرار دے دیا ہے۔

'پُرامن عبادت گزار' کے الفاظ کا استعمال کر کے اسرائیل کو کسی بھی فرد کو روکنے، ملک بدر کرنے یا اس کے خلاف طاقت کے استعمال کا حق بھی دے دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس معاہدے میں مسجد اقصیٰ کی نئے سرے سے حد بندی بھی کر دی گئی ہے اور مسجد کا جو ڈھانچہ موجود ہے صرف اسے مسجد تسلیم کیا گیا ہے جبکہ صحن کو مسجد تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی وہ دعویٰ ہے جس کی بنیاد پر اسرائیل مسجد کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہودی آبادکار اسلحے کے زور پر صحن میں گھس کر اپنی مذہبی روایات پوری کرنا چاہتے ہیں۔ عرب امارات کے بعد بحرین، سوڈان اور مراکش نے بھی معاہدات ابراہیمی کا حصہ بن کر اسرائیلی دعوؤں کو تسلیم کر لیا ہے۔

مسلم ممالک کے لیے فلسطینی ریاست سے بڑا سوال القدس کی حفاظت ہے

پاکستان سمیت تمام عالم اسلام میں اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے کے حامیوں نے کیا اس نکتے پر غور کیا ہے؟ پاکستان سمیت تمام اسلامی دنیا پہلے ہی انتہاپسند عناصر کے نرغے میں ہے اور ان سے چھٹکارا پانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ کیا مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی خودمختاری کو تسلیم کیے جانے سے انتہاپسندی روکنے کی کوششوں کو دھچکا نہیں لگے گا؟ کیا دہشتگردی کی نئی لہر نہیں اٹھے گی؟ مسجد اقصیٰ پر اسرائیلی خودمختاری تسلیم کرنے کا شائبہ بھی انتہاپسندوں کو جواز فراہم کر سکتا ہے، اس لیے مسلم دنیا کو محتاط انداز سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

2020ء اُ مشرق وسطیٰ اور مسلم دنیا کے لیے خوشگوار سال نہیں رہا اور 2021ء اُ اس سے زیادہ مشکلات سے بھرا سال ہے۔ عرب ملکوں میں خانہ جنگی، اسرائیل عرب اتحاد کے مقابل ایران اور اتحادی اور ترکی اور اس کے اتحادیوں کی جوابی مثلث سامنے آئی ہے وہ خطے میں نئے چیلنجوں اور کشمکش کو پیدا کرے گی۔

سعودی شاہی خاندان میں موجود تقسیم کو مدنظر رکھیں تو آنے والا سال سعودی مملکت کے مستقبل کے تعین اور شاہی خاندان کی قسمت کے لیے بھی فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ مسلم دنیا نئے تنازعات کا شکار ہوتی نظر آتی ہے جبکہ انتہاپسندی کی نئی لہر کے جنم لینے کے امکانات کی بنیاد 2020ء میں ہی رکھی جا چکی ہے۔

☆☆☆

کورنگی نمبر 1 یوسی 35 چکرا گوٹھ کا قبرستان

منشیات پینے والوں کی آماجگاہ بن گیا، انتظامیہ کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت

رپورٹ: ساگر راہی

کورنگی 1 نمبر یوسی 35 چکرا گوٹھ قبرستان منشیات فروشوں کے رحم وکرم پر چل رہا ہے۔ گزشتہ اتوار ایک مختصر سے سروے میں حیرت انگیز انکشافات سامنے آئے۔ کورنگی نمبر 1 یوسی 35 چکرا گوٹھ میں واقع قبرستان بہت وسیع و عریض قبرستان ہے اور اس قبرستان کو تقریباً 35 سے 40 سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ ان 35 سے 40 سالوں میں اس وسیع و عریض قبرستان میں کسی بھی قسم کی کوئی سہولت میسر نہیں، اسی سروے کے دوران دیکھا گیا کہ محلے کا سیوریج کا نظام بھی درہم برہم ہے اور سیوریج کا گندہ پانی

قبرستان میں اس طرح داخل ہورہا ہے جیسے کسی نہر کا پانی سمندر سے مل رہا ہو۔ 35 سے 40 سال پرانا وسیع و عریض قبرستان اپنی بے بسی کی ہزار داستانیں سنا رہا ہے مگر کوئی اہل ثروت اس کی داستان سننے کو تیار نہیں۔ 35 سے 40 سال پرانی قبریں آج بھی منتظر ہیں کہ کوئی مرد قلندر انکی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لے اور انکی مرمت، سیوریج اور دیگر معاملات کو بہتر کر سکے، مگر آنکھ سے اندھی اور کانوں سے بہری انتظامیہ خواب غفلت کی چادر اوڑھے سو رہی ہے اسی سروے کے دوران دیکھا گیا کہ منشیات پینے والے، فروخت کرنے والے اس قبرستان کے ٹھیکیدار بن کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ نشہ کرنے والے حضرات ڈیرہ جمائے بیٹھے ہوئے نظر آئے اسی دوران وہاں کے رہنے والے کچھ لوگوں سے وہاں کے حالات و واقعات جاننے کیلئے ان سے تاثرات لیے گئے تو انہوں نے کچھ اس طرح کا بیان دیا جس سے دل افسردہ ہوگیا سب سے پہلے محمد اصغر یہاں کے بزرگ شہری جو ڈنڈے والے بابا کے نام سے مشہور ہیں یہ بزرگ شہری 35 سال سے یہاں قبرستان میں رہ کر اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں اور پانی فروخت کر کے اپنا گزر بسر کر رہے ہیں ان سے بات چیت کے دوران انہوں نے بتایا کہ یہاں کی انتظامیہ یوسی 35 کے کونسلر کا کسی قسم کا کوئی تعاون درکار نہیں انہوں نے مزید بتایا کہ قبرستان کے حوالے سے جو بھی اخراجات یا تعمیراتی کام ہوتے ہیں یہ اپنی

مدد آپ کے تحت کرواتے ہیں۔ قبرستان میں گندگی دور کرنے کے حوالے سے انہوں نے کئی بات آواز اٹھایے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ قبرستان کی دیوار کیساتھ ہی بڑے پیمانے پر کچرا کنڈی پائی جاتی ہے اور قبرستان کے بالکل سامنے رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں جو اپنے گھروں کا کچرا اور گندگی اور گٹروں کا گندہ پانی قبرستان کی طرف کر دیا ہے۔ ان سے مزید گفتگو کی گئی اور پوچھا گیا کہ جو لوگ یہاں بیٹھ کر نشہ کرتے ہیں اس کے خلاف متعلقہ تھانے میں کوئی رپورٹ درج نہیں کی تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ کئی بار متعلقہ تھانے میں رپورٹ کی ہے مگر تھانہ بھی اس حوالے سے کوئی ایکشن نہیں لیتا۔ اسی قبرستان کا مزید سروے کیا گیا تو دوران سروے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں کمرے تو تھے مگر ان کمروں کے نہ تو دروازے تھے اور نہ ہی کھڑکیاں تھیں، یہاں نشہ کرنے والے حضرات بیٹھ کر آئس، شیشہ، چرس، ہیروئن، شراب کا نشہ کرتے ہیں۔ دو دن پہلے ہی سوشل میڈیا پر اس کی ویڈیو بنا کر ڈال چکے ہیں اس ویڈیو کا لنک ہم اس تحریر کے آخر میں منسلک کریں گے۔ مزید آگے چلتے ہیں اسی سروے کے دوران قبرستان میں ایک قبرستان بھی واقع ہے جو عبداللہ شاہ نورانی کے نام سے منسوب ہے جسے لوگ چھوٹے نورانی کے نام سے جانتے ہیں۔ یہاں کے بھی کچھ مسائل کم نہیں ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ اس مزار کے مسائل اپنی مثال آپ ہیں۔ یہاں ہماری ملاقات دوسرے بزرگ شہری سے ہوئی جن کا نام محمد عمر ہے اور یہ تقریباً 20 سال سے (باقی صفحہ 28 پر)

ورک فرام ہوم کا تجربہ

پاکستان کی نیوز ویب سائٹس کے مدیران کیا کہتے ہیں؟

فہیم پٹیل

کورونا اور اس سے پیدا ہونے والی صورتحال سے بھلا کون واقف نہیں؟ اس کرہ ارض پر شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہو جو اس وبا کے سبب آنے والی مشکلات سے محفوظ رہا ہو۔ کونسا طبقہ ہے، جس نے اس وبا کو اپنے لیے سکون و راحت کا ذریعہ سمجھا ہو؟

پھر اس بیماری کی وجہ سے ہر کام کے طریقہ کار میں تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ بڑے بڑے ہجوم میں ہونے والی محفلیں سکڑ گئیں، دوستوں، یاروں اور خاندان والوں کے ساتھ ملنا ملانا بھی محدود ہو گیا۔ بلکہ کسی کے پاس جاتے ہوئے یہی ڈر لگا رہتا کہ اس کو ہمارا آنا کہیں بُرا نہ لگے۔

صورتحال یہ ہو گئی کہ خبر کے جتنے بھی ذرائع ہیں، وہاں اسی بیماری سے متعلق خبروں نے مایوسی کے ڈیرے ڈالے رکھے۔ عام حالات میں تو جہاں کوئی حادثہ رونما ہوتا وہاں میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد سب سے پہلے پہنچے ہوتے، مگر کورونا نے یہاں بھی نظام کو ہلا کر رکھ دیا۔

اس بیماری کی آمد اور لاک ڈاؤن کے بعد جہاں باقی ہر شعبے نے گھر سے کام کرنے کو فوقیت دی، وہیں میڈیا اور خاص کر ڈیجیٹل میڈیا کی انتظامیہ نے بھی اس فارمولے کو اپنایا اور شاید تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہو کہ خبر سے تعلق رکھنے والے باہر نکلنے کے بجائے گھر سے ہی خبر کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

اس لیے بطور بلاگ ایڈیٹر میں نے اور میری ٹیم نے یہ سوچا کہ کیوں نہ پاکستان کے بڑے اداروں سے تعلق رکھنے والے مدیران سے رابطہ کیا جائے اور ان سے ان کے تجربات جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس سال لگنے والے لاک ڈاون کے بعد گھر سے کام کرنے سے متعلق ان کے تجربات کیسے رہے؟

ہم نے ان مدیران سے کچھ سوال پوچھے، اور انہوں نے بہت اچھے انداز میں ان تمام سوالات کے جوابات دیے۔ تو آیئے آپ بھی ان غیر معمولی اور دلچسپ تجربات کو جانیے۔

جہانزیب حق

چیف ڈیجیٹل اسٹریٹجسٹ، ایڈیٹر، ڈان ڈاٹ کام

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

یہ سال بہت ہی مشکل رہا۔ میڈیا پہلے ہی معاشی مشکلات کا شکار تھا اور کورونا کی وبا نے ان مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ اخراجات میں کمی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے ساتھ ساتھ ورک فرام ہوم کے چیلنجز سے لڑتے ہوئے دفتری کام انجام دینا واقعی مشکل تھا۔ ان چیلنجز کی وجہ سے پیدا ہونے والی غیر یقینی کا مقابلہ کرنا سب سے زیادہ مشکل تھا۔ آخر آدمی اپنی صحت کی فکر کرے، لوڈ شیڈنگ کی فکر کرے یا پھر تنخواہوں میں کٹوتی کی؟

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

مجھ سمیت تمام آن لائن ایڈیٹروں کے لیے ابتدائی کچھ ماہ بہت افراتفری اور دباؤ کے تھے۔ لیکن جیسے جیسے کام میں روانی آتی گئی تو ہمیں احساس ہوا کہ ورک فرام ہوم کا تجربہ خاصہ اچھا ہے۔ کچھ حوالوں سے تو یہ دفتر میں کام کرنے سے بھی زیادہ مؤثر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران حاصل ہونے والے تجربے کی وجہ سے مستقبل میں کچھ مخصوص ڈیسک اور کاموں کا انداز تبدیل ہو جائے۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں سب سے بڑا چیلنج تو غیر یقینی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی حوصلہ شکنی اور دباؤ تھا۔ اس کے علاوہ تو آپ ہر چیز سے نمٹ سکتے ہیں۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے کہ انہوں نے قابل ستائش طریقے سے اس کا سامنا کیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو شاید میں اتنا بہتر کام نہ کر سکتا جتنا عمدہ کام میری ٹیم نے کیا ہے۔ انہوں نے غیر معمولی طریقے سے کام کے دباؤ اور اپنی ذاتی زندگیوں پر پڑنے والے شدید اثرات کا سامنا کیا ہے۔ میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں جب میں ایک کاپی رائٹر تھا اور سوچتا ہوں کہ کیا میں بھی اس طرح کام کر سکتا تھا۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

کراچی میں ہونے والی مون سون بارشوں سے مختلف علاقے شدید متاثر ہوئے تھے اور اس سے کام میں بہت زیادہ خلل پڑا تھا۔ گھروں میں پانی بھر جانے اور کئی کئی دن تک بجلی نہ ہونے کی وجہ سے معمول کے

مطابق کام کرنا مشکل تھا۔اس سے ورک فرام ہوم کی ایک خامی بھی اجاگر ہوئی۔

ورک فرام ہوم کے دوران غیر یقینی اور حوصلہ شکنی کی

کیفیت پر قابو پانا ایک چیلنج تھا

فرحان محمد خان

مینجنگ ایڈیٹر،ڈان نیوز ڈاٹ ٹی وی

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

کورونا وائرس نے جس طرح پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تو یقیناً میں بھی اس دنیا کا باسی ہوں اور پوری طرح سے ہل گیا ہوں، آپ مجھے ہلا ہوا کہہ سکتے ہیں۔

سال 2020، بہت کٹھن اور مشکل رہا، بے درپے قدرتی عزیز و احباب اور ملک کی نامور شخصیات کی اموات نے غمزدہ کیے رکھا۔ سال کے آغاز میں صرف 2 ماہ ہی خیر و عافیت سے گزرے اور پھر مارچ سے اب تک ہر ماہ کسی قدرتی عزیز، مطلے دار کی دنیا سے گزرنے کی خبر غمگین کیے دیتی ہے۔ ابھی 4 دن پہلے ہی ایک دوست جس کی عمر صرف 32 سال تھی، انتقال کر گیا۔

کورونا نے جہاں نجی زندگی کو متاثر کیا وہیں پیشہ ورانہ زندگی بھی مشکلات کا شکار رہی۔

ڈان اردو ویب سائٹ کی بڑی ٹیم کو لیڈ کرنا یقیناً اعزاز کی بات ہے۔ ہم نے مارچ کے آغاز میں ہی اپنی 2 ڈیسک کو گھر سے کام کی اجازت دے دی تھی اور پھر 20 مارچ سے ہماری پوری ٹیم نے دفتری امور گھر سے انجام دینا شروع کر دیے تھے۔

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

گھر سے کام کرنا زندگی کا پہلا تجربہ تھا جو اب تک جاری ہے۔ ایسی صورتحال میں جب تمام ارکان آپ کے سامنے موجود نہ ہوں، انہیں ہدایات دینا، ان سے کام لینا اور مختلف آئیڈیاز کو سینئر کرنا بہت مشکل صورتحال تھی۔ گھر سے کام کے دوران آغاز کے 2، 3 مہینے نہایت کٹھن گزرے، بڑی ٹیم کو آن لائن سنبھالنا (مینج کرنا) آسان کام نہیں تھا۔

اور خصوصی طور پر جب آپ کراچی جیسے شہر میں رہتے ہوں جہاں بجلی اور انٹرنیٹ کی فراہمی کے مسائل ہیں تو آن لائن امور انجام دینا کسی چیلنج سے کم نہیں۔

میرے خیال میں گھر سے کام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی تھا کہ آپ کورونا وائرس سے خود کو اور اپنے گھر والوں کو بہتر طور پر محفوظ رکھ سکیں، باقی دیگر فوائد بھی ہیں لیکن نقصانات کی فہرست طویل ہے۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

گھر سے کام کے دوران سب سے بڑی مشکل بجلی اور انٹرنیٹ کی فراہمی میں تعطل تھا۔ نیوز ویب سائٹ ہونے کی وجہ سے ہمیں فوری نوعیت کی خبروں کا سامنا رہتا ہے لیکن جب ٹیم کے ارکان کے گھروں میں بجلی نہ ہو یا انٹرنیٹ کی فراہمی منقطع ہو تو خبروں کو بروقت شائع نہ کرنے سے ویب سائٹ کی کارکردگی پر منفی اثر پڑتا ہے، اور لامحالہ کام کا بوجھ ان لوگوں پر زیادہ آ جاتا ہے جن کے پاس بجلی اور انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہو۔

مئی سے اگست تک کراچی میں شدید گرمی اور بارشوں کے باعث بہت کرب ناک صورتحال کا سامنا رہا، ٹیم کے اکثر ارکان کے گھروں میں بجلی اور انٹرنیٹ کے مسائل رہے، ایسی صورتحال میں مجھے وہ امور بھی انجام دینے پڑے جو میری ذمہ داری کا حصہ نہیں تھے۔

گو کہ بطور ٹیم سربراہ ہمارے دفتری اوقات کار متعین نہیں ہیں لیکن جب دفتر سے کام کرتے تو شام میں چھٹی کے بعد گھر پر موبائل کے ذریعے نیوز ایڈیٹر یا انچارج سے سرسری رابطہ ضرور رہتا مگر گھر سے کام کرتے ہوئے صبح سے رات گئے تک باقاعدہ دفتری امور انجام دینا، کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے رہنا معمول بن چکا ہے، جس کی وجہ سے گھریلو زندگی اور خاص طور پر بچوں کے رویوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

گھر سے کام کے دوران چونکہ شروع کے کئی ماہ لاک ڈاؤن بھی رہا تو ہفتہ وار چھٹی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور شروع کے کئی ماہ بنا کسی چھٹی کے کام کیا جس کا منفی اثر مزاج اور طبیعت پر بھی پڑا۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

گھر سے کام کے آغاز میں تو سب کو ہی مشکلات کا سامنا رہا، کام کی نوعیت کے اعتبار سے ہم ایک نیوز روم میں اکٹھا کام کرتے ہیں جہاں ایک دوسرے سے خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے، کسی خبر یا شہ سرخی پر بحث و مباحثہ بھی ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں ایک اچھی خبر یا رپورٹ تیار ہوتی ہے۔ مگر گھر سے کام کے

دوران یہ سہولت میسر نہیں تھی جس کی وجہ سے کچھ پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں۔

گو کہ ٹیم سے روزانہ کی بنیاد پر مسلسل رابطے، نیوز ایڈیٹر اور انچارجز سے میٹنگ اور دیگر ارکان سے بھی آن لائن میٹنگ ہوتی رہتی مگر گھر سے کام کے دوران اسٹاف کی انفرادی کارکردگی پر کافی اثر پڑا ہے۔ تخلیقیت کا عنصر بہت کم ہو گیا ہے، نئے آئیڈیاز اور خصوصی نوعیت کی خبروں پر زیادہ توجہ نہیں دے پا رہے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ ٹیم میں نہایت پروفیشنل اور تعاون کرنے والے لوگ ہیں، اکثر ارکان نے گھر سے کام کے دوران دفتری اوقات سے کئی کئی گھنٹے زیادہ کام کیا، بجلی یا انٹرنیٹ کی معطلی پر اپنے اوقات کار کی تلافی بھی کی۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

گھر سے کام اب بھی جاری ہے اور مزید تجربہ حاصل کرنے کی گنجائش موجود ہے، اب تک کئی ناخوشگوار اور خوشگوار واقعات ہوئے ہیں۔ میں یہاں فی میل اسٹاف سے متعلق ایک تجربہ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔

خواتین کے لیے گھر سے کام کرنا کسی بڑے چیلنج سے کم نہیں تھا، ایک خاتون رکن کی جانب سے رات گئے خبر پبلش کی گئی جس پر میں نے ان سے رابطہ کیا کہ آپ اب تک کام کر رہی ہیں، حالانکہ ان کا دفتری وقت شام میں ہی ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا کہ اگر آپ اجازت دے دیں تو میں صبح 9 بجے سے رات 9 یا 10 بجے کے درمیان اپنے دفتری اوقات کو تقسیم کر لوں۔ وجہ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ گھر میں موجود ہونے کی وجہ سے انہیں ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا بھی بنانا پڑ رہا ہے، اس دوران دیگر کام بھی آ جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ چاہتی ہیں کہ ان کی شفٹ 12 گھنٹے کر دی جائے اور وہ اس دوران ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے گھر کے کام نمٹا کر آن لائن ہو جایا کریں گی۔

خواتین کے لیے گھر سے دفتری امور انجام دینا واقعی بہت کٹھن ہے اور خاص طور پر ایسی خواتین ارکان جو مشترکہ خاندانی نظام کا حصہ ہوں، وقت بے وقت شوہر، بچوں یا گھر کے دیگر لوگوں کی جانب سے اچانک چائے بنانے یا کسی کھانے کی فرمائش آ جائے اور ساتھ ہی کوئی بریکنگ نیوز ہو تو اس صورتحال پر قابو پانا صرف ایک خاتون کے ہی دل گردے کی بات ہے۔

ورک فرام ہوم کے نتیجے میں خاندانی زندگی بھی متاثر ہوئی

ہارون رشید

ایڈیٹر، انٹرنیشنل اردو

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

گزشتہ 365 دن غیر معمولی اور مشکل ترین ایام میں سے تھے۔ سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ محفوظ رہتے ہوئے گھروں سے کام کے دوران کارکردگی اور نتائج کو متاثر نہ ہونے دیا جائے۔ ایک قدرے نئی نیوز ویب سائٹ کے لیے جو اور جنرل مواد یا کنٹنٹ کے حصول پر زور دیتی ہے، اس کے لیے تو دفتروں اور بازاروں کے لاک ڈاون کی وجہ سے بندش ایک بڑا دھچکا تھا۔

تاہم اطمینان کی بات ہے کہ شدید مشکلات کے باوجود انڈیپینڈنٹ اردو کی تمام ٹیم نے نیوز گیدرنگ متاثر نہیں ہونے دی اور ملازمین کے تحفظ کو مقدم رکھتے ہوئے یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

دوسرا بڑا چیلنج کورونا وائرس سے متعلق غلط معلومات کا مقابلہ کرنا تھا۔ طب ایک اسپیشلائزڈ شعبہ ہے اور صرف ماہر افراد ہی اس تکنیکی مسئلے پر بات کر سکتے یا رائے دے سکتے تھے اور پاکستان میں رہتے ہوئے ایسے ماہرین کو ڈھونڈنا ایک مشکل کام تھا۔

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

کئی صورتوں میں یہ بات درست ہے لیکن رابطے مشکل ہو جانے سے وقتیں ضرور پیش آئیں۔ یہ تو بھلا ہو زوم کا ورنہ ورک فرام ہوم ایک بھیانک خواب بن جاتا۔ صحافت میں جہاں ایک کاپی کو کئی نظروں سے گزرنا ہوتا ہے تاکہ غلطیاں ڈور ہو سکیں اس سلسلے میں دقت رہی۔ ویڈیو مواد اکٹھا کرنے میں مشکلات رہیں کیونکہ رپورٹر باہر جا نہیں سکتے تھے۔ ایسے میں گھر پر قید ٹیم ممبران کے حوصلے بلند رکھنا بھی ایک چیلنج تھا۔ لیکن جلد ہی اکثر مسائل پر قابو پا لیا لیکن چند اب بھی موجود ہیں جنہیں روزانہ کی بنیاد پر ڈیل کیا جاتا ہے۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

گھر سے کام کرنے میں سب سے بڑی مشکل مسلسل ٹیم سے رابطے میں کمی رہی۔ انفرادی طور پر اپنے آپ کو تیار اور مونیٹیریٹ رکھنا بھی ایک بڑا چیلنج رہا۔ اس کے علاوہ ٹیکسٹ فائلیں تو با آسانی بھیجی اور موصول کی جا سکتی ہیں لیکن بڑی بڑی ویڈیو فائلز کا شیئر کرنا مشکل تھا۔

بغیر تیاری کے کپڑے پہن کر میٹنگوں میں آنا مذاق بن گیا ہے، لیکن یہ صورت درپیش رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ کوئی بھی زوم میٹنگ میں ویڈیو آن رکھنے کو تیار نہیں تھا۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

گھر سے کام کرنے کے لیے جو انفرااسٹرکچر چاہیے تھا، ادارے نے حتی الواسع کوشش کی کہ وہ مہیا کیا جائے۔ ٹیم کے ساتھی آگے بڑھ کر تجویزوں سے نمٹے، جس کے لیے وہ شاباش کے مستحق ہیں۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

گھر سے کام کرنے کے لیے اچانک صورت بنی تو ڈائننگ ٹیبل آفس ٹیبل تو بن گئی لیکن ڈائننگ کی کرسی گھنٹوں طویل شفٹس کے لیے دفتر کی کرسی نہ بن سکی۔ اس کے مسلسل استعمال سے کمر کا درد یقینی تھا، لہٰذا بازار سے نئی کرسی خریدنی پڑی۔ لیکن دوسرے ہی دن پاکستان میں بنی کرسی کے دو پاؤں نکل گئے پھر باقی تمام عرصہ اس پر جھولے لیتے ہوئے کام کیا۔ اسے میں نے کورونا کے جھولے کا نام دیا تھا۔

ورک فرام ہوم شروع ہوا تو کھانے کی میز دفتر کی میز بن گئی

اسرار احمد

نیوز ایڈیٹر، اردو نیوز

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

کورونا وائرس اور اس کے بعد لگنے والے لاک ڈاؤن نے صحافیوں کی مشکلات میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ کورونا وائرس کی وجہ سے مارچ میں ہی ملک میں لاک ڈاؤن لگ گیا اور آمد و رفت معطل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ ادارے کی جانب سے بھی یہ ہدایت کی گئی تھی کہ صحافی کسی بھی صورت میں اپنی صحت کو خطرے میں نہ ڈالیں۔ ایسی صورتحال میں کیمرہ مین اور رپورٹرز کا کام مشکل تر ہو گیا کیونکہ ان کے لیے خبر کے موقع پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

ورک فرام ہوم کو آسان سمجھا جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے قدرے مشکل تھا۔ جب آپ ایک نیوز روم میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو آپ ایک ہی وقت میں رپورٹرز سے بھی رابطے میں رہتے ہیں اور دیگر سروسز کو مانیٹر بھی کر رہے ہوتے ہیں لیکن گھر سے کام کرنے میں یہ ممکن نہیں ہوتا۔ صحافیوں کو ابتدا میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے خود کو نئی صورتحال کے حساب سے ڈھال لیا، لیکن یہ کام آسان نہیں تھا۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

ورک فرام ہوم یا دفتر سے ڈور بیٹھ کر کام کرنا انٹرنیٹ کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور پاکستان میں انٹرنیٹ کی سہولیات خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے صحافیوں کو ورک فرام ہوم میں شدید دشواری ہوئی۔

معاملہ یہ ہے کہ گھر میں آپ کے پاس جو انٹرنیٹ ہوتا ہے وہ صرف ذاتی استعمال کے لیے ہوتا ہے اور اس ضمن میں آپ کو کوئی تکنیکی مدد بھی حاصل نہیں ہوتی، ایسی صورتحال میں انٹرنیٹ کنیکشن میں خرابی یا سست رفتاری کام میں رکاوٹ اور پریشانی کا سبب بنتی ہے۔

اس کے علاوہ رفقائے کار کے ساتھ کسی موضوع پر تبادلہ خیال کرنا بھی مشکل ثابت ہوا کیونکہ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں پر موجود تھے۔ ابتدا میں ڈور بیٹھ کر تبادلہ خیال کرنا یا کسی کو کچھ سمجھانا بہت مشکل تھا لیکن آہستہ آہستہ لوگوں نے خود کو نئی صورتحال میں ڈھال لیا۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی نسبت آن لائن صحافت سے منسلک افراد نسبتاً آسانی سے ورک فرام ہوم پر منتقل ہو گئے۔ ابتدا میں ہمیں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن چونکہ ہمارا کام پہلے ہی انٹرنیٹ سے متعلق تھا اسی لیے کچھ لوگوں کو تو وقت لگا لیکن اکثر نے ورک فرام ہوم کے تجربے میں خود کو زیادہ جلدی ڈھال لیا۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

صحافت ایک ایسا پیشہ سمجھا جاتا ہے جس میں چھٹی ملنا بہت مشکل ہوتا اور لمبی چھٹی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن لاک ڈاؤن صحافیوں کے لیے مشکلات کے ساتھ ساتھ مواقع بھی لے کر آیا۔

میرا تعلق پاکستان کے ایک دور دراز علاقے سے ہے، لیکن کام کے لیے میں نے طویل عرصہ کراچی میں گزارا اور صحافت میں گزارے گئے اپنے 20 سالوں کے دوران میں کبھی بھی طویل چھٹی پر اپنے آبائی علاقے نہیں گیا، لیکن لاک ڈاؤن اور ورک فرام ہوم کی وجہ سے میرے لیے اچھا یہ ہوا کہ تقریباً 3 ماہ مجھے اپنے آبائی علاقے میں گزارنے کا موقع ملا، جو یقیناً میرے لیے خوشگوار یادوں میں سے ایک ہے۔

ورک فرام ہوم میں دفتر والی سہولیات میسر نہیں ہوتیں جس سے کام مشکل ہو جاتا ہے

منظر الٰہی

ایڈیٹر، جیو نیوز اردو

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

مجموعی طور پر 2020ء ایک مشکل سال تھا کیونکہ کورونا کی عالمی وبا نے زندگی کے ہر حصے یعنی گھر، دفتر، سماجی رابطوں سمیت ہر چیز کو متاثر کیا۔ اس عالمی وبا کو سمجھنا اور اس کے مطابق اپنے کام اور زندگی کو ڈھالنا اور خود کو اور ٹیم کو وائرس سے بچانا ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ کام کی نوعیت تبدیل ہو گئی، ہمیں اپنی ٹیم کو 'ورک فرام ہوم' پر بھیجنا پڑا جو اکثریت کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

گھر سے کام کرنا جس قدر آسان سمجھا جاتا ہے اس قدر ہے نہیں، کیونکہ بہت سے کام دفتر کے ماحول کا تقاضا کرتے ہیں، اور وہ گھر میں صرف اسی صورت ہو سکتے ہیں جب آپ گھر کا ایک کمرہ یا حصہ دفتر کے لیے مختص کر دیں اور وہاں آپ کو تنگ کرنے والا کوئی نہ ہو۔

اس کے ساتھ آپ کو آن لائن کام کے لیے اچھا انٹرنیٹ اور بجلی کی مسلسل فراہمی چاہیے ہوتی ہے۔ لاک ڈاؤن کی ابتدا میں تو بجلی کی صورتحال بہتر رہی جس کی وجہ سے معاملات کافی آسان رہے لیکن انٹرنیٹ کے مسائل خاصے رہے۔

لیکن مجموعی طور پر گھر سے کام کا تجربہ اچھا رہا کیونکہ وہ توانائی جو آپ صبح اٹھنے کے بعد تیاری اور پھر دفتر پہنچنے پر صرف کرتے ہیں، اسے بچا کر آپ کام کو نکھارنے پر صرف کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہماری

ٹیم کی مجموعی کارکردگی اس دوران بہت اچھی رہی۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

گھر سے کام کرنے سے متعلق سب سے بڑا مسئلہ اوپر بھی بتایا کہ انٹرنیٹ اور بجلی کا رہا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ورک فرام ہوم میں ٹیم کے ساتھ مسلسل رابطہ اس نوعیت کا نہیں ہوسکتا جیسا آپ دفتر میں رکھ سکتے ہیں۔

کسی بھی ٹیم میں شامل جونیئر ممبران کو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جو گھر سے کام کے دوران اس طرح سے نہیں دی جاسکتی جیسے آپ دفتر میں بیٹھ پر سکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے افراد کو اس بات پر قائل کرنا کافی مشکل ہوتا ہے کہ گھر میں موجود ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ 'چھٹی' ہے، بلکہ آپ کو روزانہ تسلسل کے ساتھ کام کو اتنا ہی وقت دینا ہے جتنا آپ دفتر میں دیتے ہیں۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

یہ صورتحال ٹیم ممبران کے لیے مشکل تھی۔ ویسے تو ہمارے ادارے نے تقریباً تمام ہی لوگوں کو دفتر سے کمپیوٹر فراہم کیے لیکن کچھ لوگوں نے اپنے لیپ ٹاپ پر ہی کام کو ترجیح دی جب کہ بعض افراد کو فوری طور پر انٹرنیٹ کا بندوبست بھی کرنا پڑا۔ لیکن ٹیم نے مجموعی طور پر اس نئی صورتحال کے لیے خود کو بہت تیزی سے تیار کیا اور انٹرنیٹ اور بجلی جیسے مسائل کے باوجود اچھے نتائج دیے۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

خوشگوار یا ناخوشگوار تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس دوران کراچی میں مون سون کی شدید بارش نے رابطے بالکل توڑ دیے تھے۔ موبائل سروسز اور انٹرنیٹ شدید متاثر ہوئے، کچھ علاقوں میں تو بجلی کئی دن بند رہی، جس کی وجہ سے آپریشن معطل تو نہیں ہوا مگر اس میں شدید مشکلات درپیش آئیں۔

گھر والوں کو اس بات پر قائل کرنا بھی مشکل ہے کہ گھر پر رہنے کا مطلب چھٹی نہیں ہے

موسیٰ کلیم

نیوز ایڈیٹر، سماء ٹی وی چینل، اردو

بطور ایڈیٹر یہ سال آپ کے لیے کیسا گزرا؟

جس طرح ہر شعبے پر کورونا کی وبا کے اثرات مرتب ہوئے، بالکل ویسے ہی میڈیا پر بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور پڑا۔ ایک نئی صورتحال کا سامنا تھا، اس وجہ سے بطور ایڈیٹر کام کی نگرانی کے دوران خصوصاً ابتدا میں مشکلات کا سامنا بھی رہا، لیکن بہرحال رفتہ رفتہ معاملات بہت حد تک قابو میں آ ہی گئے۔

ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ ورک فرام ہوم آسان کام ہے۔ اس حوالے سے آپ کا تجربہ کیسا رہا؟

گھر سے بیٹھ کر کام چلا لینا تو آسان ہوتا ہوگا، لیکن کام کرنا اتنا آسان نہیں اور میں یہ بات انچارجز سمیت تمام میڈیا کارکنان کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں۔ ممکن ہے دوسرے حضرات اس سے اختلاف کریں لیکن میرا خیال ہے کہ گھر سے کام آسان نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ گھر پر کام کا صحیح معنوں میں ماحول نہیں بن پاتا یا یوں کہیے کہ ہم صحافی اس طریقہ کار کے کبھی عادی نہیں رہے۔

کسی بھی ٹیم میں شامل جونیئر ممبران کو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جو گھر سے کام کے دوران اس طرح سے نہیں دی جاسکتی جیسے آپ دفتر میں بیٹھ پر سکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح گھر کے افراد کو اس بات پر قائل کرنا کافی مشکل ہوتا ہے کہ گھر میں موجود ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ 'چھٹی' ہے، بلکہ آپ کو روزانہ تسلسل کے ساتھ کام کو اتنا ہی وقت دینا ہے جتنا آپ دفتر میں دیتے ہیں۔

ورک فرام ہوم کے دوران سب سے بڑا چیلنج کیا رہا؟

ہمارے ادارے میں گھر سے کام کا سلسلہ مارچ تا اگست یعنی کل 5 ماہ رہا، لیکن میں نے وہ سہولت خود ہی حاصل نہیں کی اور بدستور دفتر حاضر ہو کر کام کرتا رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ میرے لیے بالکل ایک نئی بات تھی اور اس سے مفر کی گنجائش ہونے کے باعث میں نے ذہنی طور پر اسے قبول کرنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

لیکن ایسا نہیں کہ مجھے گھر سے کام کرنے کا کوئی اندازہ ہی نہ ہو، کیونکہ ہفتہ وار چھٹی والے دن بھی کام پر نظر رکھنی پڑتی ہے بلکہ کبھی کبھار اشد ضرورت پڑنے پر تھوڑا بہت کام خود بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ چونکہ ہمارا کام خاصی توجہ کا متقاضی ہوتا ہے اس لیے کم از کم میرے لیے تو گھر میں اپنی توجہ کام پر احسن طور پر مرکوز کیے رکھنا جوئے شیر لانے کے ہی برابر ہوتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ گھر والے اور خصوصاً شریکِ حیات کم گو ہوں، اس لیے چھٹی والے دن گھر سے کام کرنے کے دوران بھی بیگم کی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے اور ان کی خاصی کم اہمیت کی حامل بات کا بھی تفصیلی جواب نہ دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں جب ہم گھر پر ہوتے ہیں تو باورچی خانے کی بہتی ٹونٹی سمیت ہر چھوٹے بڑے تکنیکی فالٹ کو دور کروانا نیز بازار سے سودا سلف لانا خواہ اس وقت اس کی کوئی اشد ضرورت ہو یا نہ ہو وہ بھی ہماری ذمہ داری بن جایا کرتی ہے۔ ٹیم کے دیگر ارکان بھی جو 5 ماہ گھر پر رہ کر کام کرتے رہے، کم و بیش اسی قسم کی مشکلات سے دوچار رہے ہوں گے۔

آپ کی ٹیم نے اس چیلنج کا مقابلہ کیسے کیا؟

ادارے کی جانب سے جب یہ اعلان ہوا کہ اب گھر سے کام ہوگا تو میں نے اپنی ٹیم میں ایک ملاجلا رجحان دیکھا۔ ان میں سے چند ایک تو کام میں حائل ہونے والی دشواریوں کے باوجود اس صورتحال میں شاداں و فرحاں دکھائی دیے جس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کورونا کے باعث وہ خود بھی چاہتے تھے کہ دفتر نہ آئیں۔ ایک آدھ نے تو ورک فرام ہوم کے اعلان سے تھوڑا پہلے ہی طویل چھٹی پر جانے کی بات کرلی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ باہر سے وائرس گھر لے جائیں۔

اصل میں اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ وبا کا دورانیہ توقع سے زیادہ طول پکڑ لے گا اور 15 دن یا مہینہ بھر بھی چھٹی کر کے گھر بیٹھنا ان کے مقصد کے حصول کے لیے ناکافی ہی رہے گا، لیکن ادارے کے اعلان نے ان کی وہ مشکل خود بخود آسان کردی۔

ٹیم میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو گھر سے کام کرنے کے اعلان پر تھوڑے متفکر ہوئے اور گھر میں اپنے لیے علیحدہ کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کے انتظام میں لگ گئے۔ چند ایک ایسے بھی تھے جنہیں اپنا لیپ ٹاپ فوری طور پر ٹھیک بھی کروانا پڑ گیا۔ کچھ حضرات کے ساتھ وائی فائی کے مسائل تھے لہٰذا انہوں نے بھی فوری طور پر اس کا انتظام کیا۔

گھر سے کام کرتے ہوئے کوئی ایسا تجربہ جو بہت یادگار رہا ہو (خوشگوار یا ناخوشگوار)

گھر سے کام شروع ہونے کے بعد ٹیم اراکین کو اکثر مختلف مسائل درپیش رہتے تھے جس کے باعث کام پر بھی اثر پڑتا تھا۔ کراچی میں بجلی کی فراہمی معطل ہونا کوئی عجیب بات نہیں، یہ مسئلہ کسی بھی علاقے میں کبھی بھی پیش آسکتا ہے اور اکثر علاقوں میں تو یہ معمول کا حصہ ہی ہے۔

ہماری ٹیم کے اراکین میں سے اکثر کے ساتھ ایسا ہوتا تھا کہ ان کی شفٹ کے ٹائم میں بجلی دو ڈھائی گھنٹوں یا کبھی اس سے بھی طویل مدت کے لیے غائب ہوجایا کرتی اور وہ ڈیسک کے واٹس ایپ گروپ پر میسج کے ذریعے اعلان کردیا کرتے کہ لائٹ چلی گئی ہے مطلب یہ کہ اب اس کی واپسی تک کام آگے نہیں بڑھ پائے گا۔

اسی طرح اکثر انٹرنیٹ کی فراہمی کا مسئلہ بھی درپیش رہتا جس کے باعث ان کے لیے خبریں پوسٹ کرنا ممکن نہیں رہتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی صاحب کو اچانک کوئی ضروری کام درپیش ہوجاتا جس کی وجہ سے وہ کبھی معینہ اور کبھی غیر معینہ مدت کے لیے گھر سے باہر نکل جایا کرتے اور چند ایک مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ان کے گھر واپس پہنچتے ہی بجلی کہیں چلی گئی۔

الغرض جس طرح دفتر میں بیٹھ کر کام نسبتاً سہولت کے ساتھ اور بلاتعطل کیا جاسکتا ہے گھر سے اس طرح ممکن نہیں ہو پاتا، جس سے لامحالہ کارکردگی پر فرق پڑتا ہے۔ لیکن بہرحال وبا سے بچاؤ کی خاطر گھر سے کام کرنا وقت کی اہم ضرورت بھی ہے، اس لیے تمام تر نامساعد حالات کے باوجود پوری کوشش ہونی چاہیے کہ کارکردگی کا معیار برقرار رکھا جائے۔

بشکریہ ڈان بلاگ

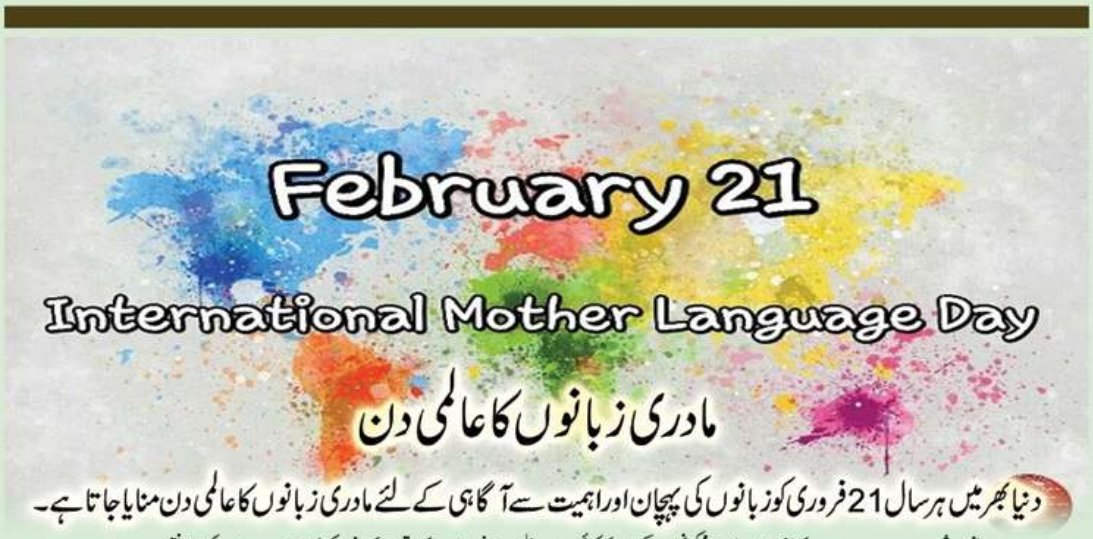

دنیا بھر میں ہر سال 21 فروری کو زبانوں کی پہچان اور اہمیت سے آگاہی کے لئے مادری زبانوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

عابد ضمیر ہاشمی

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کی انسانی ثقافتی میراث کے تحفظ کی جنرل کانفرنس کے دوران 17 نومبر 1999ء میں عام اسمبلی میں مادری زبان کی اہمیت کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا کہ ماں بولی کیلئے کیوں نہ ایک دن مخصوص کر دیا جائے۔ بحث و مباحثے کے بعد 21 فروری کا دن منتخب ہوا جسے یونیسکو کی انسانی ثقافتی میراث کے تحفظ کی جنرل کانفرنس کے اعلامیہ میں جاری کیا گیا۔ اس کے بعد 21 فروری 2000ء سے بین الاقوامی یوم مادری زبان منانے کا سلسلہ جاری ہے جسے دنیا بھر کے اہل زبان اپنی اپنی ماں بولی کے مطابق مناتے آرہے ہیں۔

مادری زبان کسی بھی انسان کی شخصیت کی تعمیر، تعلیم اور ہمہ جہت ترقی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ مادری زبان ایک امانت ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ زبان فکر و خیال یا جذبے کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ لفظوں اور فقروں کے توسط سے انسانوں کے ذہنی مفہوم و دلائل اور ان کے عام خیالات کی ترجمانی کرے۔

اولیور ویندیل ہومز کے مطابق: 'مادری زبان بدن میں لہو جیسی اہمیت رکھتی ہے جس میں سوچیں جنم لیتی اور پنپتی ہیں'، یہ ایسا سماجی عطیہ ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا ہے۔ زبان انسان کی تمام پہلی' موجودہ نسلوں کا ایک قیمتی سرمایہ اور اہم میراث ہے۔ زبان ایک ایسے لباس ہے جسے اتار کر پھینکا نہیں جاسکتا۔ زبان تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ خیالات کی حامل اور آئینہ دار ہی نہیں ہوتی بلکہ زبان کے بغیر خیالات کا وجود ممکن نہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی ایسا خیال کہ جس کے لیے کوئی لفظ نہ ہو دماغ میں نہیں آسکتا۔ شاید اسی لیے یونانی زبان کا ترجمہ کرتے ہوئے انسان کو حیوانِ ناطق کہا گیا۔ حیوانِ ناطق سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ انسان بول سکتا ہے' بولتے تو سب جانور ہیں۔ اس سے مراد ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر بول سکتا ہے۔ لارڈ بینی سن نے کہا تھا کہ: 'الفاظ فطرت کی طرح ہیں جو آدھے پوشیدہ اور آدھے ظاہر ہوتے ہیں۔'

زبان انسانی زندگی کا اہم جز ہے۔ مقامی یا مادری زبانوں کو انسان کی دوسری جلد بھی کہا جاتا ہے۔ مادری زبانوں کے ہر ہر لفظ اور جملے میں قومی روایات' تہذیب و تمدن' ذہنی و روحانی تجربے پیوست ہوتے ہیں' اسی لیے انہیں ہمارے مادی اور ثقافتی ورثے کی بقا اور اس کے فروغ کا سب سے موثر آلہ سمجھا جاتا ہے۔

مشہور برطانوی کہاوت ہے کہ ''برٹن زبان کے بغیر برٹن بھی کچھ نہیں۔'' یعنی زبان کے بغیر فرد کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ بلاشبہ مادری زبان کسی بھی انسان کی ذات اور شناخت کا اہم ترین جزو ہے' اسی لیے اسے بنیادی انسانی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔ اقتصادی' سماجی اور ثقافتی حقوق پر بین الاقوامی معاہدے کے مشمولات کے علاوہ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم' سائنس اور ثقافت کی قراردادوں کی صورت میں اس حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ قومیتی شناخت اور بیش قیمت تہذیبی و ثقافتی میراث کے طور پر مادری زبانوں کی حیثیت مسلّمہ ہے۔

پاکستان' ہندوستان' امریکہ' افریقہ' چین' روس' فرانس' جرمنی' ایران' اٹلی و دیگر ممالک کی اقوام کی اپنی علیحدہ زبانیں ہیں جو کہ اقوام کے افراد کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اسی طرح ہر ملک کی ایک قومی زبان ہوتی ہے جس سے ہر ملک کے افراد کی نشاندہی ہوتی ہے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان پنجابی ہے جسے 48 فیصد افراد بولتے ہیں جبکہ 12 فیصد سندھی' 10 فیصد سرائیکی' انگریزی' اردو' پشتو 8 فیصد' بلوچی 3 فیصد' ہندکو 2 فیصد اور ایک فیصد براہوی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 6912 زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے 516 ناپید ہوچکی ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ زبانیں پاپوانیوگنی میں بولی جاتی ہیں جہاں کل زبانوں کا 12 فیصد یعنی 860 زبانیں بولی جاتی ہیں جبکہ 742 زبانوں کے ساتھ انڈونیشیاء دوسرے' 516 کے ساتھ نائجیریا تیسرے، 425 کے ساتھ بھارت چوتھے اور 311 کے ساتھ امریکا پانچویں نمبر پر ہے۔ آسٹریلیا میں 275 اور چین میں 241 زبانیں بولی جاتی ہیں۔

مختلف اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی مادری زبان چینی ہے جسے 87 کروڑ 30 لاکھ افراد بولتے ہیں جبکہ 37 کروڑ ہندی' 35 کروڑ ہسپانوی' 34 کروڑ انگریزی اور 20 کروڑ افراد عربی بولتے ہیں۔ پنجابی 11 اور اردو بولی جانے والی زبانوں میں 19 ویں نمبر پر ہے۔ مادری زبانوں کے فروغ اور تحفظ کی تمام کوششیں نہ صرف لسانی رنگا رنگی اور کثیر اللسانی تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں' بلکہ یہ دنیا بھر میں پائی جانے والی لسانی اور ثقافتی روایات کے بارے میں بہتر آگہی بھی پیدا کرتی ہیں اور عالمی برادری میں افہام و تفہیم' رواداری اور مکالمے کی روایات کی بنیاد بنتی ہے۔

کرہ ارض پر انسان 5700 سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں مگر ان مادری اور مقامی زبانوں کو چند زبانوں کے وائرس سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ خاص طور پر انگریزی دنیا کی ہزاروں مقامی زبانوں کو نگل گئی ہے اور ابھی بھی اس کی زبان خوری ختم نہیں ہوئی۔ چند اقوام اور طبقات کی لسانی دہشت گردی سے زبانیں محبت و اخوت کے بجائے نفرت و تقسیم کا موجب بننے لگی ہیں۔ اس سے عالمگیریت کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ 29 فروری 1956ء کو بنگالی کو سرکاری سطح پر پاکستان کی بنیادی ریاستی زبانوں میں سے ایک کا درجہ دے دیا گیا۔ یہی لسانی تحریک بعد ازاں سقوط ڈھاکا کا ایک اہم سبب ثابت ہوئی۔ اسی دن کی یاد میں یونیسکو کے ممبر کی حیثیت سے بنگلہ دیش نے مادری زبانوں کے عالمی دن کی تجویز منظور کروائی۔ مادری زبانیں بطور ذریعہ اظہار و ابلاغ فرد کی شخصیت کی تشکیل و تکمیل میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ چیک ری پبلک کے صدر جین کوان نے جنرل اسمبلی سے مادری زبانوں کے حوالے سے خطاب میں کہا تھا کہ: 'مادری زبان ہمارے مادی اور غیر مادی ورثے کے تحفظ اور ترقی کا بہترین وسیلہ ہے۔'

آج کے جدید دور میں مادری زبان میں تعلیم بنیادی انسانی حق ہے۔ دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دیئے جانے کا انتظام ہوتا ہے کیونکہ بچے کے ذہن میں راسخ الفاظ اس کے اور نظام تعلیم کے درمیان ایک آسان فہم اور زود اثر تفہیم کا تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم سے بچے بہت جلدی نئی باتوں کو سمجھ جاتے ہیں، انہیں ہضم کر لیتے ہیں اور پوچھنے پر بہت روانی سے انہیں دھرا کر سنا

دیتے ہیں۔ مادری زبان میں دی جانے والی تعلیم بچوں کی تعلیمی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہے جس کے نتیجے میں وہ خوشی خوشی تعلیمی ادارے میں بھاگتے ہوئے آتے ہیں اور چھٹی کے بعد اگلے دن کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔

معلم کے لیے بھی مادری زبان میں بچوں کو تعلیم دینا بہت آسان ہوتا ہے اور اس کے لیے اسے اضافی محنت نہیں کرنا پڑتی اور مہینوں کا کام دنوں یا ہفتوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ مادری زبان کی تعلیم سے خود زبان کی ترویج و اشاعت میں مدد ملتی ہے' زبان کی آبیاری ہوتی ہے' نیا خون داخل ہوتا ہے اور پرانا خون جلتا رہتا ہے جس سے صحت مند اثرات اس زبان پر مرتب ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرہ ہمیشہ سے ارتقاء پذیر رہا ہے چنانچہ مادری زبان اگر ذریعہ تعلیم ہو تو انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس علاقے کی مادری زبان بھی ارتقاء پذیر رہتی ہے' نئے نئے محاورے اور روزمرے متعارف ہوتے ہیں' نیا ادب تخلیق ہوتا ہے اور استعمال میں آنے والی چیزوں کے نئے نئے نام اس زبان کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔ کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان مٹا دو تو قوم کی روایات' اس کی تہذیب' اس کی تاریخ اور اس کی قومیت غرض سب کچھ مٹ جائے گا۔ بلاشبہ پھولوں کی رنگارنگی گلدستے کا حسن اور طاقت ہوتی ہے' قباحت اور کمزوری نہیں۔

جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا پر فریفتہ ہو' وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے۔ قوم بے جان افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہوتا' بلکہ قوم معتقدات' تاریخ' ثقافت اور انفرادیت پر اصرار سے ہی وجود میں آتی ہے اور استحکام حاصل کرتی ہے۔ مذکورہ قومی عناصر کے اظہار کا اہم ذریعہ زبان ہی تو ہوتی ہے۔ جب لوگوں سے اُن کی زبان چھین لی جائے تو ان سے سب کچھ چھین لینے کے مترادف ہی ہوتا ہے۔ ہمیں بھی قومی یکجہتی کے گلدستے کی تشکیل کے لیے زبانوں کی رنگارنگی کو اہمیت اور فروغ دینا ہوگا۔ کیونکہ کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان مٹا دو تو قوم کی روایات' اس کی تہذیب' اس کی تاریخ' اس کی قومیت سب کچھ مٹ جائے گا۔ ہمیں اگر اقوام میں زندہ رہنا ہے' تو مادری زبان کو ترجیح دینا از بس ضروری ہے۔

حافظ غلام صابر

دنیا بھر میں ہر سال 21 فروری کو زبانوں کی پہچان اور اہمیت سے آگاہی کے لئے مادری زبانوں کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

نومبر 1999ء کو انسانی ثقافتی ورثہ کا تحفظ کی جنرل کانفرنس کے موقع پر یونیسکو نے مقامی زبانوں کے احیاء و بقاء کے لئے سال 21 فروری کو مادری زبانوں کا عالمی دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ بلاشبہ زبان کسی بھی انسان کی ذات اور شناخت کا اہم ترین جزو ہے اسی لیے اسے بنیادی انسانی حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں تقریباً 7 ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔

پاکستانی ماہرین لسانیات کے مطابق ملک بھر میں مختلف لہجوں کے فرق سے 74 بولیاں/ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ 48 فیصد پاکستانی پنجابی زبان بولتے ہیں۔ اس کی ادبی روایت کئی صدیوں پر محیط ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر رحمت اللہ علیہ کی شاعری اور نوشہ گنج بخش رحمت اللہ علیہ کی نثر سے لے کر آج تک اعلیٰ زبان میں بے شمار کتابیں تخلیق ہو چکی ہیں۔ لیکن صد افسوس کہ آج تک اس زبان کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہو سکا جو اس کا اولین حق تھا۔ یہ ادنیٰ اعتبار سے کسی بھی دوسری زبان سے پیچھے نہیں اس میں ہمارے دین و مذہب، علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا بیش قیمت سرمایہ موجود ہے۔

پاکستان اور ہندوستان میں کی گئی مردم شماری کے مطابق دنیا میں پنجابی بولنے والوں کی تعداد 15 کروڑ سے زائد ہے۔ انگریز نے فاتحانِ عالم کی طرح ہمت اور بہادری کے ساتھ برصغیر کو فتح نہیں کیا بلکہ تاجروں کا بھیس بدل کر روٹی کی بھیک مانگتے ہوئے ہندوستان میں آیا اور مغلیہ حکمرانوں کے سامنے دامن پھیلا کر تجارتی سہولیات حاصل کیں لیکن موقع ملتے ہی لٹیروں اور ڈاکوؤں کی طرح اپنے ہی محسنوں کے گھر پر قبضہ کر لیا۔ انگریز نے قدم جمانے کے بعد مقامی زبانوں کو نظر انداز کر دیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان مٹا دو' تو قوم کی روایات، تہذیب، ثقافت، تاریخ اور اس کی قومیت غرض سب کچھ مٹ جائے گا۔ مادری زبان انسان کی شناخت، ابلاغ، تعلیم اور ترقی کا بنیادی ذریعہ ہے لیکن جب زبان ناپید ہوتی ہے تو اس کے ساتھ تہذیب و تمدن اور ثقافت کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دیے جانے کا انتظام ہوتا ہے کیونکہ بچے کے ذہن میں راسخ الفاظ اس کے اور نظام تعلیم کے درمیان ایک آسان اور زود اثر تفہیم کا تعلق پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن انگریز نے پنجاب میں رائج نظامِ تعلیم کو ختم کرتے ہوئے پرائمری تک تعلیم کے لیے ،قامی زبانوں (سندھی، بلوچی اور پشتو) کی جگہ اردو زبان کو لازمی قرار دیا۔ جبکہ فارسی کی جگہ انگریزی سرکاری زبان بنا دی گئی۔ انگریزی بولنے اور پڑھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلانے لگے، باقی سب جاہل تھے۔

انگریز نے غلامی کا وار اس انداز میں کیا کہ مسلمانوں کا صدیوں سے رائج نصاب بے وقعت ہو گیا۔ ایک طرف مسلمان معاشی طور پر دلدل میں پھنستے چلے گئے تو دوسری طرف تعلیمی میدان میں انگریزی زبان کے فروغ کا زور و شور ان کو لے ڈوبا۔ علم و عمل کی بنیاد پر برصغیر پر ہزار سال حکومت کرنے والی مسلم قوم کو ایک دم جاہل گنوار بنا کر رکھ دیا گیا۔ انگریز کی اس کاری ضرب کی وجہ سے مسلمان اندھیروں میں ڈوبتے چلے گئے۔ پنجاب کے وہ سورے جو عظیم ہیرو تھے انہیں ڈاکو اور لٹیرے بنا کر پیش کیا گیا۔ اس طرح پنجاب کی نئی نسل اپنی ہی زبان اور ثقافت پر نازاں ہونے کی بجائے شرمندگی محسوس کرنے لگی۔ انگریز نے پنجاب پر قبضہ کیا کیا، اس نے یہاں کے لوگوں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا اور انگریزی زبان کو اتنا اونچا درجہ دے دیا کہ عوام دیسی زبانیں بولنے میں شرمندگی محسوس کرنے لگے۔

نو آبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد بھی ہر شعبہ ہائے زندگی میں انگریزی کو ہی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی ایک ترقی یافتہ اور جدید سائنسی علوم کے ذخیرے سے مالا مال زبان ہے۔ لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی بھی قوم نے اپنی زبان اور روایات چھوڑ کر کسی غیر کی زبان اور تہذیب و تمدن کو اپنا کر کبھی ترقی نہیں کی۔ کیونکہ مادری زبان انسان کی شناخت، ابلاغ، تعلیم اور ترقی کا بنیادی ذریعہ ہے لیکن جب زبان ناپید ہوتی ہے تو اسکے ساتھ ثقافتوں اور روایات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جن معاشروں میں دانشور اپنی دھرتی کے ساتھ جُڑے رہتے ہیں اور ان کا تعلق اپنی مٹی کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے تو ان ممالک کی عوام اپنی ثقافت، زبان اور اپنی تاریخ پر فخر کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں ہر صورت اپنی ماں بولی کا بغیر کسی تعصب کے ضرور تحفظ کرنا چاہیے۔

حکومتِ وقت مادری و علاقائی اور قومی زبانوں کے ادباء و شعراء اور محققین کی سرپرستی کرے، ان کی تخلیقات کو سرکاری سطح پر شائع کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر عالمی زبانوں کی کتب کو قومی و علاقائی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ہماری قوم اندھیروں سے نکل کر وقت کے ساتھ ساتھ دنیا میں اپنا آپ منوا سکے۔ یونیورسٹیوں میں سندھی، بلوچی، پنجابی زبان اور پشتون زبانوں میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی پروگرامز بھی شروع کیے جا چکے ہیں تاہم ان ڈگریوں کی معاشی اہمیت چونکہ محدود ہے کیونکہ ماں بولی کے احترام کے سوا عملاً کچھ نہیں ملتا۔ پنجابی زبان تو ایک طرف آج تو اردو بھی عملاً سرکاری زبان نہیں اور اسے بھی انگریزی کی ضرورت کے سبب علاقائی زبانوں کے خیمے میں پناہ لینی پڑ گئی ہے۔

حکومتِ پاکستان کو چاہیے کہ ابتدائی کلاسز میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ دنیا کے کئی ممالک نے مادری زبانوں کی ضرورت و اہمیت کو مانتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ ہر بچے کو اپنی مادری زبان میں تعلیم کا حق حاصل ہے اور تمام زبانوں کی بلا امتیاز ترویج و ترقی شہریوں کے بنیادی حقوق اور ریاستی فرائض کا حصہ ہے۔ لیکن پاکستان میں آج بھی علاقائی زبانوں کی اہمیت اور مقام و مرتبے پر بحث جاری ہے۔ اگرچہ سندھ میں سندھی، خیبر پختونخوا میں پشتو اور بلوچستان میں بلوچی ابتدائی تعلیمی درجات میں پڑھائی جاتی ہے لیکن پنجاب میں پنجابی زبان کی ترویج و اشاعت کی سرکاری سطح پر کبھی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

مادری زبان میں تعلیم سے بچے بہت جلد نئی باتوں کو سمجھ جاتے ہیں اور اس سے بچوں کی تعلیمی صحت پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جس سے زبان کی آبیاری ہوتی ہے، اس کے برعکس جن اقوام کا اپنی ہی مٹی سے تعلق کمزور ہو جاتا ہے شکست اور ذلت و پستی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ پرائمری سے تمام صوبوں میں مقامی زبانوں کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔

عابد ضمیر ہاشمی

5 فروری یوم یکجہتی کشمیر کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن پاکستان اور آزاد کشمیر میں عام تعطیل ہوتی ہے۔ دُنیا بھر میں مقیم پاکستانی اور کشمیری یہ دن اس جذبے کے ساتھ مناتے ہیں کہ مقبوضہ ریاستِ جموں و کشمیر کے عوام جو ہندوستان کے خلاف جدوجہد آزادی میں مصروف ہیں، کے ساتھ بھرپور اظہار یکجہتی ہو۔ اس دن سرکاری اور عوامی سطح پر جلسے جلوس' سیمینار کے علاوہ پاکستان و آزاد کشمیر کو ملانے والے کوہالہ پُل اور راستوں پر انسانی زنجیریں بنائی جاتی ہیں۔

اہل پاکستان مقبوضہ کشمیر کے ساتھ اخلاقی' سفارتی اور سیاسی حمایت جاری رکھنے کے اپنے عہد کا اعادہ کرتے ہیں۔ اب ہر روز ہی اظہار یکجہتی منایا جائے پھر بھی کم ہے، کیونکہ مودی سرکار نے ظلم و بربریت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے، 5 اگست 2019ء کو جبری طور پر یک طرفہ، اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے، کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی اور پھر مزاحمت کے ڈر سے آج تک محاصرہ، لاک ڈاون برقرار ہے۔ وادیِ کشمیر فوجی چھاونی کے ساتھ ہی دُنیا کی سب سے بڑی جیل میں تبدیل ہو چکی، جس میں 90 لاکھ انسان خوراک، ادویات کی شدید قلت، سخت سردی کے باعث زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے شمال مغرب میں واقع ایک ریاست ہے جس کا کل رقبہ 69547 مربع میل ہے۔ یہ ریاست 1947 کے بعد جموں کشمیر میں تقسیم ہو گئی۔ اس وقت بھارت 39102 مربع میل پر جبری طور قابض ہے جو ''مقبوضہ کشمیر'' کہلاتا ہے۔ اس کا دارالحکومت سری نگر ہے، بقیہ علاقہ آزاد کشمیر کہلاتا ہے جو 25 ہزار مربع میل رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا دارالحکومت مظفر آباد ہے۔ ریاست کی کل آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے جس میں سے 40 لاکھ آزاد کشمیر میں ہیں۔

ہندو راجاؤں نے تقریباً 4 ہزار سال تک اس علاقے پر حکومت کی۔ 1846ء میں انگریزوں نے ریاست جموں کشمیر کو 75 لاکھ روپوں کے عوض ڈوگرہ راجا غلام سندھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ کشمیر کی آبادی 80 فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہندو راجا نے بزور شمشیر مسلمانوں کو غلام بنا رکھا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندو مہاراجہ ہری سنگھ نے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف 26 اکتوبر 1947 کو بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا، اس کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت میں جنگ کا آغاز ہوا۔

سلامتی کونسل کی مداخلت پر یکم جنوری 1949ء کو جنگ بندی ہو گئی۔ سلامتی کونسل نے 1948ء میں منظور شدہ دو قراردادوں میں بھارت اور پاکستان کو کشمیر سے افواج نکالنے اور وادی میں رائے شماری کشمیر کروانے کے لیے کہا۔ اس وقت بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے رائے شماری کروانے کا وعدہ کیا مگر بعد ازاں اس وعدے سے منحرف ہو گئے۔ پاکستان نے بھارت سے آزاد کرائے گئے علاقے میں آزاد کشمیر کی ریاست قائم کر دی جبکہ مقبوضہ کشمیر کا تنازعہ اب بھی جاری ہے، بھارت نے یک طرفہ تقسیم کر کے آزادی کشمیر تحریک کو مزید دوام بخشا، حالانکہ اس مسئلے کے حل میں اقوام متحدہ کا عالمی فورم، کشمیری عوام کے استصواب رائے

کے مطالبے کو تسلیم کر چکا ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان اب بھی یہی مسئلہ تنازعے کی صورت میں برقرار ہے اور دونوں ممالک اس سلسلے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ کشمیر کا بچہ بچہ آج بھی اسے پاکستان کا حصہ ہی تسلیم کرتا ہے اور وہاں کشمیر کی آزادی کے نام پر شہادت پانے والوں کو آج بھی پاکستان پرچم میں لپیٹ کر سپرد خاک کیا جاتا ہے۔

ویسے تو کشمیری حریت پسند آزادی کی یہ جنگ گزشتہ 70 سال سے بدستور لڑ رہے ہیں جس کی پاداش میں 40 لاکھ سے زائد کشمیری بے گھر ہو چکے ہیں جبکہ ڈیڑھ لاکھ سے زائد لوگ آزادی کی اس راہ میں جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ 70 سال سے وہاں تعینات بھارتی فوجیوں، انٹیلی جنس فورسز اور پولیس نے، جن کی تعداد آج 8 لاکھ سے زائد ہو چکی ہے، نے مسلمان نہتے کشمیریوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

روزانہ کی بنیاد پر وہاں خواتین کی عصمتیں تار تار کی جارہی ہیں، ماں اور بہنوں سے ان کے سہاگ چھینے جارہے ہیں، لاکھوں بچے یتیم ہو رہے ہیں، مگر آج بھی ان کشمیریوں کے لب پر ایک ہی صدا گونج رہی ہے: ''کشمیر بنے گا پاکستان''۔ بھارتی افواج کے مظالم میں دن بدن بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے جس کے تحت نہ

صرف مرد، خواتین اور بچوں کو شہید کیا جارہا ہے بلکہ بزرگوں کو بھی نہیں بخشا جارہا، ظلم کی حد تو یہ ہے کہ کشمیر کے نوعمر لڑکوں اور نوجوانوں کی آنکھیں نکالی جارہی ہیں، ان پر ربڑ اور لوہے کی وہ گولیاں برسائی جارہی ہیں جو اس قدر مہلک ہیں کہ شکار کے دوران بڑے جانوروں جیسے گینڈے اور ہاتھی پر برسائی جاتی ہیں اور انسانوں کیلئے ممنوع ہیں، جبر کے ان ہتھکنڈوں کے نتیجے میں لاتعداد افراد معذور ہو رہے ہیں۔ مگر ماسوائے اللہ کے، ان کا بھری دنیا میں کوئی حقیقی حال سے واقف نہیں۔ عالمی فورم اور اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی بن کر اس ظلم و بربریت کو دیکھ رہے ہیں جبکہ انسانی حقوق کا چیمپئن امریکا، بھارت سے تجارتی تعلقات بہتر بنانے کیلئے اس سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔ شاید وہ مقبوضہ کشمیر کو بھارت ہی کا حصہ تسلیم کر چکا ہے، وہ کسی نہ کسی طریقے سے بھارت کی سرپرستی کرنے میں مصروف عمل ہے۔

اس سلسلے میں مظلوم کشمیریوں کے عزائم کچھ اور ہیں، ان کی رگ رگ میں جدوجہد آزادی، خون کی مانند بہہ رہی ہے اور وہ الحاق پاکستان چاہتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح؟ نے 1946ء ؁ میں مسلم کانفرنس کی دعوت پر سرینگر کا دورہ کیا تو وہاں اپنی دور اندیش نگاہوں کے سبب سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور جغرافیائی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کشمیر کو ''پاکستان کی شہ رگ'' قرار دے دیا۔

مسلم کانفرنس نے بھی کشمیری مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے 19 جولائی 1947 کو سردار ابراہیم خان کے گھر سری نگر میں باقاعدہ طور پر قرارداد الحاق پاکستان منظور کی، مگر بھارت نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ اس پر کشمیریوں نے بھارتی افواج کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کر دی جو اب تک جاری ہے۔

کشمیری عوام اپنے موقف پر بہادری سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ وہ آزادی لے کر رہیں گے، انہیں اوچھے ہتھکنڈوں سے نہ ڈرایا جاسکتا ہے نہ دبایا جاسکتا ہے۔ کشمیر کی آزادی اور الحاق پاکستان تک ہماری جدوجہد بدستور جاری رہے گی، خواہ اس کے نتیجے میں ہمیں اپنی گود کے بچوں کی جانوں کا نذرانہ کیوں نہ دینا پڑے۔ آزادی کشمیر کی جنگ عقیدے اور آزادی کی جنگ ہے، جس کیلئے ہمیشہ کشمیری سیسہ پلائی دیوار بن کر کھڑے رہیں گے۔

5 فروری کو منائے جانے والے یوم یکجہتی کشمیر کے موقع پر نہ صرف پورا پاکستان بلکہ پورا آزاد کشمیر بھی اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں سے مکمل طور پر اظہار یکجہتی کرتا ہے۔ آج کا دن تقاضا کرتا ہے کہ زبانی نہیں بلکہ اب ایک بار پھر مسلمان نوجوان، فاتح محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور سلطان صلاح الدین ایوبی بنیں تاکہ کشمیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا جاسکے۔

بقیہ :۔ چکرا گوٹھ قبرستان

مزار شریف پر ہی رہائشی ہیں اور خدمت کر رہے ہیں۔ انکا کہنا تھا کہ یہاں کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں ہے نہ تو زائرین کیلئے وضو کرنے کی جگہ ہے اور نہ ہی انکے لئے باتھ روم ہیں، انکا مزید کہنا تھا کہ اس مزار کی تعمیرات اور دیگر جو بھی کام ہیں وہ اپنی مدد آپ کے تحت کرتے ہیں۔ یوسی 35 کے کونسلر یا انتظامیہ کا انھیں بھی کوئی تعاون حاصل نہیں انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ہم حکومتی اداروں سے، اعلیٰ افسران سے اور بالخصوص محکمہ اوقاف کے افسران سے گزارش کرتے ہیں کہ اس طرف بھی ایک نظر اٹھا کر دیکھ لیں یہ سروے یہی پر اختتام پذیر نہیں ہوا ہم نے مزار کے دیگر مقامات کا بھی سروے کیا اور ہم اس جگہ پر پہنچے جہاں صاحب مزار آرام فرما تھے وہاں بھی ہمیں ایک بزرگ شہری جن کا نام گل محمد ہے جب انکا بیان سنا تو دل خون کے آنسو رونے لگا انکا بیان کچھ اس طرح سے تھا انہوں نے ہمیں ایک کمرے کا سروے کروایا جہاں مزار شریف کا سامان مثلاً لائٹ، پنکھے، دیواروں کا رنگ و روغن موجود ہوا کرتا تھا مگر حالات کے ستائے ہوئے لوگ وہ سارا سامان چوری کر کے لے گئے نہ صرف اتنا گل محمد نے مزید بتایا کہ چور ڈاکو مزار شریف کے چندے کا بکس کا تالا توڑ کر جتنے بھی پیسے تھے سب لیکر چلے گئے اس سارے واقعے کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں بھی کی گئی بلکہ ایف آئی آر بھی کٹوائی گئی مگر کوئی سنوائی نہیں ہوئی یہ تھی ساری روداد یہاں کے رہنے والوں کی جو اپنے آپ میں ایک مثال ہے اور ہم سب کیلئے ایک سوالیہ نشان۔۔۔۔۔؟

اب بات کرتے ہیں انتظامیہ، یوسی 35 کے افسران کی، متعلقہ تھانے میں بیٹھے افسران کی موجودہ حکومت کی، وزیر اعلیٰ سندھ کی، محکمہ اوقاف کی، اس حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے مگر ان سے کیا شکایت کرنے کا فائدہ بھی کیا ہوگا جب کوئی سنوائی ہی نہیں تو شکایت کس سے کریں۔ مگر ہاں ان اعلیٰ افسران سے درخواست ضرورت کر سکتے ہیں کہ خدارا شہر کراچی کے تمام قبرستانوں کا ذاتی طور پر جائزہ لیں ایسے ان گنت مسائل وہاں آپکو ملیں گے، سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ قبرستان میں گندگی، کچرا کنڈی، اور سیوریج کا گندہ پانی جو کہ قبرستان میں داخل ہو رہا ہے۔ اہل علاقہ یا اس قبرستان کے اردگرد رہنے والے اپنے پیاروں کی تدفین کرنے آتے ہیں تو انھیں بہت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے اور اسی گندگی سے گزر کر قبرستان میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد منشیات فروشوں کا مکروہ دھندہ اپنے عروج کی منزلیں دن بہ دن بڑی تیزی کیساتھ اپنا سفر طے کر رہا ہے۔ مگر متعلقہ تھانے میں بیٹھے افسران ابھی بھی خواب غفلت کی چادر زیب تن کئے ہوئے بیہوشی کی نیند سو رہے ہیں، ایس ایس پی لانڈھی اور ایس ایس پی کورنگی یا ایس ایچ او کورنگی یا جو بھی اعلیٰ افسران ہیں ان سے اپیل ہے کہ خدارا کورنگی نمبر 1 یوسی 35 چکرا گوٹھ میں نشہ کرنیوالوں کیخلاف قانونی کارروائی عمل میں لائی جائے۔ تمام افسران بالا، بحکومتی ادارے، قانون نافذ کرنے والے ادارے بالخصوص محکمہ اوقاف کے اعلیٰ افسران سے پرزور اپیل کرتے ہیں کہ خدارا شہر کراچی کے تمام مزارات کیلئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو قبرستان اور یہاں موجود مزارات کے دیرینہ مسائل کو دور کر سکیں تمام مزارات پر سیکیورٹی کا نظام رائج کیا جائے تاکہ پھر کسی مزار کے چندے کے بکس کے تالے نہ توڑے جائیں، پانی کا بہترین نظام کیا جائے تاکہ زائرین کیلئے اور یہاں کے جو رہائشی ہیں انکے لیے باتھ روم بنائے جائیں، وضو کیلئے خصوصی انتظام کیا جائے، قبرستان کے احاطے میں جو کچرا کنڈی، گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اسکو ختم کیا جائے تاکہ مزار پر آنے والے زائرین کو آنے جانے میں آسانی ہو جو لوگ اپنے پیاروں کی تدفین کرنے آتے ہیں انکے کپڑے خراب نہ ہو اور انھیں تدفین کرنے میں آسانی ہو۔

☆☆☆

اسٹریٹ کرائمز قابو سے باہر کیوں؟

صوبائی دارالحکومت لاہور میں سٹریٹ کرائم کی وارداتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ قابل فکر بات یہ ہے کہ جرائم پیشہ افراد کے اندر اتنی ہمت اور بڑی وارداتیں کرنے کا حوصلہ کہاں سے پیدا ہوا؟ چند روز قبل ایک خبر ٹی وی سکرین کی زینت بنی کہ لاہور میں موٹر سائیکل سوار 2 ڈکیت شہری سے ایک کروڑ 90 لاکھ روپے لوٹ کر فرار ہو گئے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ملک میں جرائم پیشہ افراد کس حد تک باخبر اور بے باک ہو چکے ہیں۔

اسی طرح ایک ماہ قبل کی خبر تھی کہ جوہر ٹاؤن کے مشہور کیفے میں 2 لڑکے رش کے بیچ و بیچ آئے اور ریستوران کے باہر والے حصے میں بیٹھے درجنوں شہریوں کو ایک پستول کے زور پر یرغمال بنایا اور ان سے 10 موبائل فونز لے کر تسلی کیساتھ پارکنگ سے گاڑی نکالی اور سروس روڈ کے ذریعے فرار ہو گئے۔

قابل فکر بات یہ ہے کہ جرائم پیشہ افراد کے اندر اتنی ہمت اور بڑی وارداتیں کرنے کا حوصلہ کہاں سے پیدا ہوا؟ اور تو اور ایک اور خبر یہ بھی تھی کہ لاہور کے پوش علاقے میں 2 ڈاکوؤں نے گلی میں جاتے لڑکے کو پستول کے زور پر روکا، اور جب اس کے پاس کچھ نہ نکلا تو اسکا ''پیزا'' ہی لے گئے۔ یہ تمام واقعات جہاں ہمارے شہروں میں بڑھتے جرائم کا ثبوت دیتے ہیں وہیں یہ فکر بھی بڑھاتے ہیں کہ اب ان سے چھٹکارا کیسے پایا جائے گا؟

ان جرائم میں برآمدگی اور گرفتاری کا تناسب کم ہے جرم کی اگر باقاعدہ تعریف کی جائے تو یہ ایک ایسا فعل ہے جو قانونی طور پر ممنوع ہے، جس سے انسانی زندگیوں، ان سے وابستہ اخلاقیات اور ریاست کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچتا ہو اور قانون میں اسکے لئے کوئی نہ کوئی سزا بھی مقرر ہو۔ جرائم مختلف اقسام کے ہو سکتے ہیں، مثلاً انسانوں کے خلاف جرم، جائیداد کے خلاف جرم، وائٹ کالر جرائم، اسٹریٹ کرائم اور حتیٰ کہ اپنی ذات کے خلاف جرم (جس میں خودکشی کی کوشش کرنا بھی شامل ہے)۔ انسانوں کے خلاف جرائم میں قتل، اقدام قتل، ٹارگٹ کلنگ، دہشت گردی، بم دھماکے، جھگڑا، فساد، کسی انسان کو زخمی کرنا، ملازموں پر تشدد، جنسی زیادتی شامل ہیں۔ جائیداد کے خلاف جرائم میں بینک ڈکیتی، پٹرول پمپ ڈکیتی، مویشی چوری، گھروں کی چوری وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح وائٹ کالر جرائم وہ ہیں جن کا ارتکاب اعلیٰ اور عزت دار طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی ملازمت کے دوران کرتے ہیں، اپنی ہی ذات کو نقصان پہنچانے والے جرائم میں نشے کی عادت اور خودکشی شامل ہیں۔ جبکہ بہت سے ایسے جرائم بھی ہیں جو گلی محلوں میں عام انجام دیے جاتے ہیں، جن میں عام لڑکے، لڑکیوں، بچوں، بزرگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے، انھیں ''سٹریٹ کرائمز'' کہتے ہیں۔

> جس معاشرے میں غربت وافلاس، بیروزگاری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، لاقانونیت، بنیاد پرستی، ناخواندگی، پسماندگی، مہنگائی اور بے راہ روی کا دور دورہ ہو، اس معاشرے میں جرائم بڑی تیزی سے پنپتے ہیں۔ اور ایسے میں ان جرائم کو کنٹرول کرنا اور ان سے عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سٹریٹ کرائمز بھی اسی لئے بڑھ رہے ہیں۔

ان میں جیب کتری، موبائل، پرس، کار، موٹر سائیکل، نقدی اور دوسری اشیاء اسلحے کے زور پر چھیننا شامل ہیں۔ چند سال قبل تک یہ جرائم زیادہ تر خالی بازاروں، سنسان سڑکوں اور پوش علاقوں میں دیکھنے میں آتے تھے۔ مگر اب یہ ہر جگہ اور حتیٰ کہ رش کے عالم میں بھی ہو رہے ہیں، جن کے دوران اب تک بہت سی قیمتی جانیں بھی ضائع ہو چکی ہیں۔ پاکستان میں گلی محلوں کے جرائم میں اضافے کی خبریں ان دنوں عام ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب آپ کو کسی گلی، محلے، شہر سے کوئی ایسی اطلاع نہ ملتی ہو یا سوشل میڈیا پر ویڈیو سامنے نہ آئے کہ کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی واردات ہو گئی ہے۔

اسٹریٹ کرائمز کا عروج؟

ویسے تو پاکستان کا اب کوئی بھی ایسا علاقہ، چھوٹا یا بڑا شہر اس سماجی برائی سے محروم نہیں، مگر عمومی تاثر یہ ہے کہ سٹریٹ کرائمز کے واقعات زیادہ تر بڑے شہروں میں ہو رہے ہیں جن میں کراچی اور پھر لاہور، راولپنڈی اور پشاور قابل ذکر ہیں۔ دنیا کے بڑے شہروں میں جرائم کی صورت حال پر سروے کرنے والے بین الاقوامی ادارے ''نمبیو'' کی 2019 کے اواخر میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق لاہور میں جرائم کی مجموعی شرح 42 فیصد رہی جبکہ سال 2018 میں یہ 46.9 فیصد تھی۔ مگر سٹریٹ کرائمز پھر بھی ہو رہے ہیں۔ فرق یہ آیا کہ اب ان وارداتوں کی ویڈیوز جلد منظر عام پر آ جاتی ہے، جس سے جلد گرفتاری ممکن ہو سکتی ہے۔ اسی ادارے کی رپورٹ کے مطابق دنیا کے غیر محفوظ ترین شہروں میں کراچی 71 ویں نمبر اور لاہور 174 ویں نمبر پر ہے۔

کراچی میں اسٹریٹ کرائمز

شہر قائد میں سٹریٹ کرائم کی وارداتیں نئی بات نہیں، یہ جرائم ہمیشہ اس شہر کیلئے خوف کی علامت رہے ہیں۔ ٹارگٹ کلنگ، بھتہ خوری، اغواء برائے تاوان اور دیگر سنگین جرائم کیساتھ ساتھ سٹریٹ کرائم بھی

ایک ایسا جن ہے جو بے قابو ہو چکا ہے۔ پوش علاقے ہوں یا متوسط طبقے کے علاقے ہر جگہ پر شہری روزانہ کی بنیاد پر قیمتی اشیاء سے محروم ہو رہے ہیں۔ 2020 کے اختتام پر نومبر میں کراچی میں سٹریٹ کرائمز کی 5375 وارداتیں رپورٹ ہوئیں، مسلح ملزمان نے اسلحے کے زور پر شہریوں کو قیمتی موبائل فونز، بینکوں موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں سے محروم کیا۔ سٹیزن پولیس لائزن کمیٹی کیا عداد و شمار کے مطابق شہر قائد میں ماہ نومبر میں یومیہ تقریباً 179 اور ہر گھنٹے میں سٹریٹ کرائمز کی 7 وارداتیں رپورٹ ہوئیں، سب سے زیادہ موٹر سائیکل چوری کی 3172 وارداتیں ہوئیں جبکہ دوسرے نمبر پر شہریوں کے ہاتھوں سے 1843 موبائل فون چھینے گئے۔ شہر کے مختلف علاقوں سے 14 گاڑیاں اسلحہ کے زور پر چھینی اور 141 گاڑیاں چوری کرلی گئیں جبکہ صرف 33 گاڑیاں ہی برآمد کی جاسکیں۔ یوں برآمدگی اور گرفتاری کا تناسب کم نظر آرہا ہے۔

مختلف علاقوں میں شہریوں سے 205 موٹر سائیکلیں اسلحہ کے زور پر چھین لی گئی اور 3 ہزار 172 موٹر سائیکلیں چوری کی گئیں جبکہ صرف 193 موٹر سائیکلیں ہی برآمد کی جاسکیں۔ اسی طرح ایک مہینے میں 1 ہزار 843 موبائل فونز شہریوں سے چھینے گئے۔ صرف 221 ہی موبائل فونز برآمد کیے جا سکے۔ برآمدگی کا تناسب انتہائی کم ہے۔ مختلف علاقوں میں بھتہ خوری کی 3 اور قتل کے 31 واقعات رپورٹ ہوئے۔ پھر دسمبر میں کراچی پولیس نے شہری جرائم خصوصاً سٹریٹ کرائم کے حوالے سے ایک اور خصوصی رپورٹ تیار کی، جس میں بتایا گیا کہ کہ شہر کے 7 اضلاع میں ایک ہزار سے زائد بڑے منشیات فروش اور جرائم کے مافیاز سرگرم ہیں، جن میں سب سے زیادہ ضلع غربی اور وسطی میں ہیں۔

لاہور میں سٹریٹ کرائمز

لاہور پولیس کی رپورٹ کے مطابق سال 2021 کے پہلے مہینے جنوری میں جرائم کی پے در پے وارداتوں نے شہریوں کو پریشانی اور خوف میں مبتلا کیے رکھا، صرف پہلے ماہ میں لاہور میں مختلف وجوہات کی بنا پر 30 افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، جن میں 4 افراد ڈکیتی مزاحمت پر مارے گئے۔ ایک ماہ میں راہزنی اور ڈکیتی کی 295 سے زائد وارداتیں ہوئیں، جبکہ رپورٹ بتاتی ہے کہ جنوری کے آخری 10 ایام میں پستول کے زور پر شہر میں کم وبیش 5 کروڑ سے زائد کی ڈکیتی کی وارداتیں ہوئیں۔ 30 جنوری کا واقعہ ہے کہ ہال روڈ جو کہ اچھی خاصی رش والی جگہ ہے وہاں موٹر سائیکل سوار ڈاکوؤں نے اسلحہ کے زور پر شہری سے لاکھوں روپے کی رقم چھین لی اور فرار ہوگئے۔ اس سے کچھ دن قبل لاہور کے علاقے کاہنہ میں فرنیچر شوروم میں ڈکیتی کی واردات کے دوران ڈاکو شوروم سے ڈیڑھ لاکھ روپے نقدی اور دیگر سامان لوٹ کر فرار ہوئے تھے جبکہ ماہ جنوری میں ہی کوٹ لکھپت میں شہری سے 8 لاکھ لوٹ لیے گئے تھے، جس پر مزاحمت کرنے والے گارڈ کو قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح نومبر میں موسم سرما کے آغاز پر پولیس کے اعداد و شمار کے مطابق لاہور کے 84 میں سے 35 تھانوں کی حدود میں اسٹریٹ کرائمز میں 18 سے 20 فیصد تک اضافہ دیکھا گیا۔ جن میں تھانہ شاہدرہ، رائے ونڈ، تھانہ شالیمار چھاؤنی، تھانہ باغبانپورہ، ماڈل ٹاؤن، اسلام پورہ اور تھانہ فیکٹری ایریا وغیرہ میں صورت حال میں زیادہ بگاڑ دیکھنے میں آیا۔

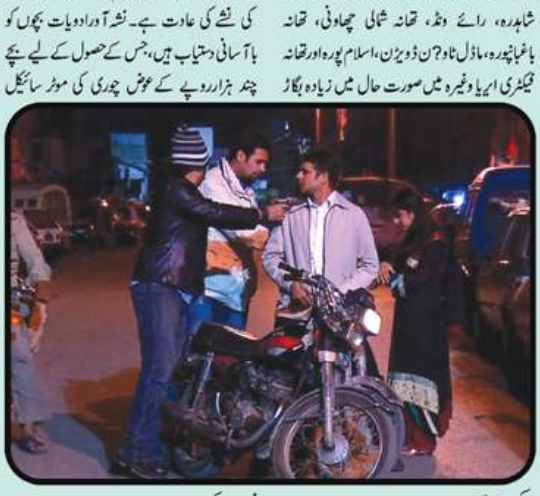

اسٹریٹ کرائم میں نوعمر بچے ملوث؟

بدقسمتی سے پاکستانی معاشرے میں نو عمر بچے یا نوجوان سٹریٹ کرائمز میں سب سے زیادہ ملوث ہوتے ہیں، جو اپنے خوابوں کی تعبیر محنت، تعلیم، قلم و کتاب کی بجائے اسلحہ کے زور پر تلاش کرنے لگے ہیں۔ جس عمر میں ان کے ہاتھ میں قلم اور کتابیں ہونی چاہئیں وہ چاقو اور پستول تھامے ہوئے ہیں۔ آج صورتحال یہ ہے کہ نوعمر بچے بالخصوص لڑکے جن کی عمریں 10 سے 15 سال کے درمیان ہیں وہ معمولی چوری چکاری، جیب تراشی، اٹھائی گری میں ہی ملوث نہیں بلکہ بڑی ڈکیتیوں، گھروں، گوداموں اور دکانوں میں چوری کی وارداتوں کے ساتھ ساتھ رہزنی، کار و موٹر سائیکل چوری کرنے جیسی سنگین وارداتوں میں بھی ملوث ہیں۔ پنجاب کے بڑے شہروں، لاہور، فیصل آباد گوجرانوالہ میں نوعمر بچے جرائم کی دلدل میں زیادہ پھنسے دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور پولیس کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ 8 ماہ کے دوران سٹریٹ کرائمز کے 30 فیصد کیسز میں ملوث افراد کی عمریں 14 سے 18 سال کے درمیان تھیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق پنجاب میں جیلوں میں اس وقت 618 نوعمر بچے مختلف جرائم میں قید ہیں، جن میں سب سے زیادہ تعداد سنٹرل جیل فیصل آباد میں 148 ہے۔ یہ صورتحال کراچی میں بھی سنگین ہے۔ کراچی پولیس کے مطابق گلی محلوں میں 11 سے 12 سالہ بچوں کے جرائم میں ملوث ہونے کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے، یہ بچے موٹر سائیکل اور موبائل لوٹ کر بہت ہی کم قیمت میں فروخت کر دیتے ہیں۔ اور اس عمر کے بچوں میں جرائم بڑھنے کی بڑی وجہ ان کی نشے کی عادت ہے۔ نشہ آور ادویات بچوں کو باآسانی دستیاب ہیں، جس کے حصول کے لیے بچے چند ہزار روپے کے عوض چوری کی موٹر سائیکل فروخت کر دیتے ہیں۔

اسٹریٹ کرائمز میں اضافے کی وجوہات

جس معاشرے میں غربت و افلاس، بیروزگاری، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، لاقانونیت، بنیاد پرستی، ناخواندگی، پسماندگی، مہنگائی اور بے راہ روی کا دور دورہ ہو، اس معاشرے میں جرائم بڑی تیزی سے پنپتے ہیں۔ اور ایسے میں ان جرائم کو کنٹرول کرنا اور ان سے عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سٹریٹ کرائمز بھی اسی لئے بڑھ رہے ہیں۔ غربت زدہ علاقوں میں رہنے والے نوجوانوں کے لئے انتخاب کا فقدان ہے۔ جرائم کے سرگرم مافیا جو جگہ بیٹھے ہیں، وہ ان نوجوانوں کو اپنا شکار بناتے ہیں، اور جب ان نوجوانوں کے پاس بھی کوئی زریعہ معاش نہیں ہوتا تو پھر جرائم کی جانب ہی راغب ہوتے ہیں۔ اسی طرح سڑکوں، گلیوں میں ہونے والے جرائم کی بڑھتی تعداد میں اضافے کی ایک اور بڑی وجہ غیر قانونی اسلحہ رکھنا بھی ہے، جس سے نمٹنے کے لئے حکام کو سخت رویہ اپنانا ہوگا، ناکوں کی تعداد بڑھا کر نوجوانوں کے خلاف تلاشی کو تیز کیا جانا چاہیے، کیونکہ غیر قانونی اسلحہ رکھنا نہ صرف سٹریٹ کرائم بلکہ ہر طرح کے جرائم کی علامت ہے۔ اس کی بنیادی وجوہات کی نشاندہی کرنا یا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ نوجوانوں میں اسلحہ رکھنا یا کسی گروپ میں شامل ہونا اور جارحانہ رویہ اپنانا ضروری محسوس ہوتا جا رہا ہے۔ اس پر تحقیق کرنی چاہیے۔

سٹریٹ کرائمز کی زیادہ تر رپورٹیں تھانے میں نہیں لکھوائی جاتیں۔ زیادہ تر لوگ پولیس کی جانب سے صحیح اور بروقت اقدام نہ کئے جانے، رشوت ستانی اور ملزمان کو پکڑنے کی بجائے سائل کو بے جا تنگ کرنے اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کے خوف سے پولیس کو اپنے ساتھ ہونے والے جرائم سے آگاہ نہیں کرتے۔ اس طرح بڑی تعداد میں جرائم کے کیس درج نہیں ہو پاتے۔ جو کہ غلط ہے، ہر بندے کو کیس لازمی رپورٹ کروانا چاہیے، اور پولیس کو بھی عوام کے ساتھ اعتماد کی فضاء قائم کرنی چاہیے، تاکہ حکام کے پاس اس علاقے اور طریقہ واردات کا ریکارڈ موجود ہو، جو مستقبل میں ایسے کیس روکنے کیلئے مفید ثابت ہو سکے۔ اسی طرح ہمارے ہاں، مجرمان تک پہنچنے اور تفتیش کا نظام اتنا مثالی اور جدید نہیں، جتنا آج کے زمانے میں ہو چکا ہے، اس طرف بھی توجہ دیتے ہوئے نظام کو جدید بنانا ہوگا۔ اس سنگین معاملے میں بہت زیادہ قصوروار ہمارے تمام حکمران بھی ہیں، جنھوں نے کئی دہائیوں سے قوم کے نوجوانوں کی تعمیر کیلئے صرف نعرے لگائے ہیں مگر ان کو مثبت سرگرمیوں میں شامل کرنے کے لئے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت نے اسٹریٹ کرائم کو روکنے کے لئے کوئی ٹھوس حکمت عملی پیش نہیں کی، اور نہ ہی نوجوانوں کو مجرمانہ سرگرمی سے دور رکھنے کے لئے کوئی خاطر خواہ اقدامات کئے۔ جبکہ یہ ناسور ایک قومی مسئلہ بنتا جا رہا ہے، جس طرح ملک کے معاشی و سیاسی مسائل اہم ہے، وہیں اس مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنا بھی اہم ہے۔ مغربی دنیا میں دیکھیں انتخابی منشور میں ہمیشہ نوجوانوں کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے واضح پالیسیاں موجود ہوتی ہیں اور انھیں مجرمانہ سرگرمیوں سے دور رکھنا، اور خوشحال سرگرمیوں کے مواقع فراہم کرنے کے وعدے کیے جاتے ہیں، جو پورے بھی ہوتے ہیں۔ لہذا ہمارے حکمرانوں کو بھی نوجوانوں کی طرف ہنگامی بنیادوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے ورنہ ہم اسٹریٹ کرائم کے بحران کو کبھی حل نہیں کر پائیں گے۔

☆☆☆

ABC CERTIFIED

WWW.HRPOSTPK.COM

Pakistan's 1st Human Rights Educator

HUMAN RIGHTS POST

HRP

14 YEARS

Service to Human Rights Publications

Vol:14 Issue 1-2 JANUARY-FEBRUARY 2021

How Russia's special Afghan envoy wants to save the struggling peace process

Social Media Is Smokes And Mirrors

Plastic Waste Is The New Gold: Informal Vs Formal Sector

انسانی حقوق پر پہلی نیوز ایجنسی، حکومت پاکستان سے منظور شدہ

HRNW

اردو اور انگریزی میں خبروں کی ترسیل

www.hrnww.com hrnww.com/urdu

HRNW

PAKISTAN'S 1ST HUMAN RIGHTS NEWS AGENCY

Regd:SS-No.1260

How Russia's special Afghan envoy wants to save the struggling peace process

Russia has a tangible incentive to see its diplomatic initiatives in Afghanistan succeed

Russian Special Envoy to Afghanistan Zamir Kabulov gave an exclusive interview to publicly financed Sputnik about his plan to save the country's struggling peace process. He was quoted as condemning the US for unilaterally violating the deal that it agreed to last year with the Taliban, which he said was strictly adhering to the accord. Kabulov also proposed the creation of an inclusive transitional coalition government after the Taliban's official political status is determined. Another highlight from his interview is that he suggested that the Russian capital might soon host another round of talks based on the Moscow format of his country, the Afghan stakeholders, the US, and neighbouring states. His comments coincided with NATO discussing the US' plans to delay its originally promised withdrawal of troops by May and the visit of Indian Foreign Secretary Shringla to Moscow where the diplomat talked about Afghanistan among other topics of shared interest.

Although Russia officially designated the Taliban as a terrorist organisation, this hasn't precluded the country from pragmatically engaging with the group on a political basis in order to incorporate it into the peace process. To this end, Moscow even hosted the Taliban on several occasions. These events were extremely symbolic considering the fact that the Taliban grew out of the 1980s Mujahidin movement that was formed to fight against the Soviet military during Moscow's ultimately disastrous intervention there during the last decade of the Old Cold War. This proves just how much Russia's geostrategic calculus has changed in the years since. Instead of aspiring to regain its lost superpower status, Moscow's 21st-century grand strategic ambition is to become the supreme "balancing" force in Eurasia, which explains its recent cooperation with a slew of non-traditional partners such as Turkey, Saudi Arabia, Azerbaijan, and Pakistan.

It was the last-mentioned of these four which presumably facilitated Russia's initial interactions with the Taliban considering its historic relations with the group. That was among the first and most regionally influential outcomes yet of their rapid rapprochement with one another. Russia is uniquely positioned to play a leading role in the Afghan peace process because it's truly a neutral actor in the conflict. In addition, its pragmatic political relations with the Taliban in spite of their historic discord with one another speaks to just how trusted of an actor Moscow has become for all sides. This confirms the success of Russia's "balancing" act in Afghanistan and the larger Central-South Asian region that this geostrategic state sits smack dab in the middle of. Keeping in mind the continental implications of the country's peace process, it can therefore be said that Russia is nowadays playing an important diplomatic role in resolving a conflict that impacts all of Eurasia.

Other than the prestige that success on this front would afford it, Russia is also interested in seeing this outcome because it would enable the country to advance President Putin's vision of an Arctic-Indian Ocean corridor that he first shared during his speech at the Valdai Club's annual meeting in October 2019. The Russian President said that "There is one more prospective route, the Arctic – Siberia – Asia. The idea is to connect ports along the Northern Sea Route with ports of the Pacific and Indian oceans via roads in East Siberia and central Eurasia" when elaborating on an important dimension of his country's "Greater Eurasian Partnership". Pakistan's unofficial N-CPEC+ plan to extend CPEC northwards through Afghanistan to the Central Asian Republics and ultimately Russia perfectly dovetails with President Putin's southern-directed vision to establish an Arctic-Indian Ocean corridor.

The success of this mutually beneficial proposal depends on ensuring the security of the RuPak Corridor, which only the Taliban can provide since it's the most powerful fighting force in Afghanistan. The official determination of the group's political status and prospective inclusion in a transitional coalition government would therefore go a long way towards achieving this goal and eventually attracting more international investment into the project from other interested partners. This means that Russia has a tangible incentive to see its diplomatic initiatives in Afghanistan succeed since this outcome would result in securing one of its envisioned axes of North-South Eurasian connectivity which forms a crucial pillar of its "Greater Eurasian Partnership". Kabulov will therefore do everything that he can to bring this about, hence his increasingly active role in trying to save the struggling Afghan peace process.

Why Pakistan's textile sector needs a helping hand

The duties on imported yarn have caused a profound shortage in raw material of late

Muhammad Zohaib Jawaid

While the textile sector continues to be an export cash cow for Pakistan, the national share in the global textile trade has experienced an incessant contraction. This paradox is evidenced by the fact that the textile sector has limped behind Bangladesh, India, China, and Vietnam in the wake of various bottlenecks, including an overvalued rupee and exorbitant power tariffs.

The former was addressed when the currency could not sustain its artificially uplifted value. However, the cost of electricity remained elevated. For instance, the local textile players were coerced to consume electricity at 11.5 cents per kWh at the start of the year when the same was available at 7.5 cents per kWh in China, 9 cents per kWh in Bangladesh, and 8 cents per kWh in both Vietnam and India. This made it onerous for them to compete for market share against these counterparts.

The odds were swayed so badly in favour of others that the government had to withdraw surcharges in February. This culminated in the provision of electricity at 7.5 cents per kWh for the sector until it was increased to 9 cents per kWh in September. The tariff is again costlier than what the exporters in other countries pay. It amplifies the industry's woes that had already been limited to operating in off-peak hours because of further high peak hour's rate.

Amidst this storm, the incumbents promulgated a relief package for all industries. The government calls it an economic masterstroke that will foster productivity and employment. In that case, the package must effectively reduce the energy burden on manufacturing units of the country's prime export, textile. Let us find out if this assumption is valid.

At this time, Pakistan is savouring a heap of international textile orders due to an economic head-start. Besides, many textile orders from America are being rerouted to Pakistan due to the excessive duties levied on imports from China. Thus, the exporters will look to fetch new orders and operate double shifts. The energy cost for the shift during off-peak hours remains the same. However, the quashing of additional electricity tariffs across the board during peak hours means that the second shift will prove propitious.

Therefore, in this shift, the cost charged per kWh will incorporate 50% and 25% concessions for small and medium enterprises (SMEs) and large-scale manufacturing (LSM) respectively. The effective tariff will now be 6.75 cents per kWh for SMEs and 7.875 cents per kWh for LSM (assuming both the shifts have identical working hours). According to a report titled "Pakistan in the Apparel Global Value Chain", published by the World Bank and Duke Value Chains Centre, SMEs only contribute roughly 10% to Pakistan's textile industry. When we take this composition into account, the effective average tariff for the sector becomes 7.76 cents or Rs. 12.4 per kWh ($1 = Rs. 160).

Hence, the package invigorates the industry by reducing the tariff borne by exporters by 13.7%. It provides a level-playing field in the post-lockdown global trade dynamics where tariffs in the region range from 7 to 9 cents per kWh. Besides, it offers a greater relief to SMEs, which is a rarity in Pakistan since only the industrial giants have previously been able to extract benefits from rebates and subsidies.

The textile sector grew by 8.42% in October compared to September 2020 and by 6.2% on a year-on-year basis. Now is the time to gain more ground so that the exports back at the pre-Covid level witness a further upturn. The resumption of a 50% tariff discount on incremental power consumption extended to SMEs is subject to review in June next year, but the SMEs will still be able to avail 25% markdown for a further two years, even if the government decides against a renewal. Likewise, the government seems reluctant to augment the power tariff any time soon in the wake of an exacerbated political atmosphere and inflated food prices. How long it can resist the direction of the International Monetary Fund (IMF) in this regard is yet to be seen.

However, the favourable returns of the package will be limited until the government reduces customs and regulatory duties on imported cotton yarn and machinery. The duties on imported yarn have caused a profound shortage in raw material of late. Pakistan has become reliant on imported cotton yarn primarily due to a reduction in cotton production locally. On the flip side, duties on machinery curtail the industry from ameliorating productivity levels. The industries and finance ministries must mull upon demanded automation, relaxation of duties, simplification of tax laws, and amendment of rules to further facilitate the sector.

Who Should Be Responsible For Reducing Global Warming – Governments Or Individuals?

By Fatima Cheema

Many people admit their role in damaging our mother nature. Individuals are more likely to be affected and thus sensitized by environmental changes than governments. In Pakistan, for example, dense smog was observed in 2016 which hindered day to day activities of individuals. The government showed concern; however, no significant action was taken against it. The higher authorities stressed upon creating awareness about it but its implementation rests in the hands of public.

The global warming is fraught with disastrous consequences for humans. In view of its tremendous importance research has been conducted worldwide to find out how to control and reverse this phenomenon. The studies have been reviewed in the form of a book, the bestseller entitled "Drawdown : The Most Comprehensive Plan Ever Proposed to Reverse Global Warming ". The data sorted out, has been analyzed and used to solve the global warming problems through formulation of 80 models. The book largely emphasizes upon solutions based on an individual's activities. It thus depends on how individuals at household level react and help in averting global warming. If the public reduces the consumption of non-renewable sources then large scale producers will also be discouraged from exploiting finite sources of energy. Therefore, use of environment friendly products should be encouraged at individual level, for instance, use of paper bags instead of plastic bags in grocery stores. This would also discourage factories from producing goods made of plastic that are detrimental to the environment, thus highlighting the importance of collective reactive power.

Digital technology has entered a number of areas of commercial significance . Emergence of online marketing at international level is one of them. As a result of such an online deal China annually dispatches 15 million mail-packages to Finland. (Helsingin Sanomat, 3 March 2019). The dispatch of such a huge cargo through different transport means across long international distances serves as a source of environmental pollution through emission of greenhouse gases and thus criminalizes as a culprit in global warming. Such environmental hazards can be obviated through development of innovative national policies, designed to inculcate predilection among the populace for consumption of indigenous products manufactured through environment-friendly processes.

Modern innovative practices have been introduced in agriculture, particularly towards the end of the last century. This has led to massive agricultural production. To offset adverse effects of global warming, farming techniques based on environment friendly methods, ought to be introduced. These new methods directly or indirectly reduced the amount of greenhouse gases released in the atmosphere. Researchers in Stanford University led studies on this aspect and recorded their findings in a publication. Steven Davis, co-author of the paper, as a result of the investigation, recommended investment in agriculture as a cheap means of avoiding emission of greenhouse gases. High demand for scarce resources such as water and energy has impelled farmers to look for and apply more innovative farming practices such as dry farming, using drip irrigation and planting cover crops. If farmers show inclination towards learning advanced scientific techniques to grow crops and raise livestock then the government may also be moved to set up institutions and model farms for training them on modern lines. However, in Pakistan reluctance to these latest methods has been observed as people complain that this has led to reduced labor requirement and high unemployment.

Chaudhary Abdul Hameed, Director, Faisalabad Agriculture (Extension), opined that the earnings of a farmer, made in his profession, also depend upon how much favorably inclined he is towards new developments in agriculture. But it is now dire need of the hour to adopt modern methods for food production and meet the increased needs of food for rapidly growing population.

Excessive use of fossil fuels in agriculture and the resultant share it had towards greenhouse gas emission necessitated search for its replacement. Installation of solar panels and wind turbines on farms as a source of renew able energy was engineered as a substitute. Technology for production of renewable energy being at a nascent stage of development it required improvement in its efficient use. Other steps deemed desirable to reduce environmental pollution include less use of fertilizers and pesticides derived from petroleum products. Besides farming practices, storage and movement of crops may also preferably be based on renewable energy.

In consequence it could be concluded that quality of natural environment should be maintained through efforts both at grass root level and through official policies. The role of government and higher authorities cannot be negated but it is the attitude of public at large that brings about a significant change.

The Wretched Condition Of Pakistan's Prisons Continues To Aggravate

By Sulman Ali

The condition of Pakistani prisons has historically been abysmal, largely owing to a lack of proper legislation or reforms since 1947, when the country got its freedom. Any chance visit to the jails unearths the plight of prisoners and the failures of the administration. Lack of cleanliness and hygiene prevails across Pakistani jails. Although there have been repeated reports of prisoners dying in the jails, there has never been a huge outcry. Former President Asif Ali Zardari was tortured, beaten, and humiliated in jails during the Pakistan Muslim League-Nawaz (PML-N) government in the 1990s.

The second major aspect behind this whole scenario is the social image of a prisoner in Pakistan. Sociologists underline that Pakistani society tends to take a jail inmate, as a less human or not a person who deserves any sympathy or rights. Society, largely, thinks that the individual gets what they deserve, and hence, does not merit any compassion.

Last year, Islamabad High Court (IHC) ordered the establishment of a commission to investigate human rights abuses in the country's prisons. The court order came after a prisoner submitted a petition, stating that he lost his eyesight due to abuse by the administration of Adiala Jail in Rawalpindi. The commission was headed by Federal Minister for Human Rights Shireen Mazari and included ex-chairman of Human Rights Commission Zohra Yousaf, former director-general FIA Tariq Khosa, chief secretaries of four provinces, interior secretary, and the federal health secretary. In its verdict, the court, headed by Justice Athar Minallah, said that the commission has been formed in view of the "alarming state of affairs regarding the serious violation of human rights and civil liabilities of prisoners incarcerated in prisons across the country."

In January 2020, the commission presented its report and it painted a horrific picture of jails across the country. The report stated that the jails are overcrowded, have serious chances of spreading diseases, and showcase a wide array of human rights abuses. As per the report, there are 77,000 inmates in the country's jails, although they have the capacity of only 56,634 individuals. The report stated that: "In Punjab alone, 29 out of the 41 prisons are overcrowded whereas in Sindh 8 prisons are overcrowded."

In addition to the problem of overpopulation, the data shows the serious human rights violations in jails. As per data, there are almost 2100 prisoners with physical ailments, while around 2400 are suffering from contagious diseases like Hepatitis, HIV, and Tuberculosis, while 600 inmates suffer from mental diseases. Under the Pakistan Prison Rules, the prisoners have the right to adequate medical facilities. However, the report mentioned that almost half of the sanctioned posts of medical staff in jails are vacant.

The report also mentioned that the prisoners are not adequately informed about their rights

at the time of sentencing and therefore continue to face a violation of human rights.

COVID-19 is still a serious threat and is spreading in the overcrowded jails of Pakistan, as the country is facing the second wave of the virus. As per media reports, earlier in May, over 300 prisoners were infected with the virus. Keeping in view the situation, high courts of all provinces ordered the provinces to release the individuals, jailed in minor crimes. According to media reports, Punjab was all set to release 20,000 prisoners from the jails to tackle the COVID-19 issue in March this year. However, the five-member bench of the Supreme Court, headed by Chief Justice Gulzar Ahmad, revoked the high courts' orders and suspended all bail orders. In its verdict, the top court said how the high courts could order the release of under-trial inmates. "Coronavirus is a grave matter. Under what pretense did the IHC issue the directives for releasing the prisoners?" the top court said. The decision led to the halting of all releases and till now the prisoners are overcrowded.

Expressing, its apprehension, Human Rights Watch stated that the release of 20,000 prisoners would have halved the number in Punjab jails. "A justice system that caused the problem of overcrowding in the first place also stood in the way of resolving it," the HRW said in its statement.

The data, reports, and a visit to any local jail show that the prisoners in Pakistani jails are living in dire situations, and unfortunately, there seems to be no light of hope for them in the near

Pakistan's petroleum pricing quagmire

Petroleum prices continue to be a core talking point in Pakistani politics. The impact is such that decisions related to a price hike or cut are taken by the premier himself every fortnight on the merit of the Oil and Gas Regulatory Authority's (OGRA) recommendations. In the past, many regimes manifested the desire to deregulate oil pricing but backtracked when they foresaw sizable political repercussions.

The incumbents find themselves in a tight spot with a threefold surge in crude oil – Brent internationally (from $20 to $60), a relatively low petrol and diesel price in USD (see the graph below), a reduction in Petroleum Levy (PL) to Rs. 17.97 for petrol and Rs. 18.36 for diesel, but a considerably elevated nominal petrol price at the same time. The problem for the ruling party worsens in case there is a further rally in Brent's prices.

The crux of this petroleum snag lies in the pricing mechanism which prevails in Pakistan. For a market that evolves daily, the practice of calculating price on an aggregate fortnightly or monthly change and, that too, just on the stocks of PSO was inimical to every stakeholder. The oil marketing companies (OMCs) had to wait and deliberate what a possible change could be before the OGRA's announcement and the PM's consenting nod. This made the process time-consuming, unpredictable, and the malpractices kicked in.

For OMCs, the process was a zero-sum game where a steep rise augmented their earnings while a sharp downturn significantly ate out their profits. It is why every increment in petrol prices stirred temporary shortage until the new prices were applicable. On the flip side, major pruning of prices also caused a shortfall when the OMCs imported average on petroleum was higher than that of PSO. Hence, they held back the stock, which triggered a demand shock, and the prices were pushed up again.

So, the government rightly indexed pricing on a fortnightly basis with Platts Oil-Gram instead of PSO's monthly import price. They can notify the IFEM, OMC, and dealers' margin in advance for a specific period to automate the process, which will enable the OMCs to preempt the forthcoming price change.

As far as deregulation is concerned, the experts may not have a consensus on the efficacy of a pure free market, but they agree that the existing procedure is also not worth continuing. The very idea of deregulation in Pakistan seems disturbing owing to recurring market failures in the form of collusions and cartelisation in the presence of a clueless Competition Commission of Pakistan (CCP). However, this does not downplay the need to deregulate the market to induce efficiency, competition, and trickle-down price-benefit to the consumer.

So, what changes can make the system better-off for the government, the OMCs, and – most of all – acutely price-sensitive consumers?

The government can deregulate the prices but confine the OMCs to a daily price-range. This will aid in circumventing a possible unholy alliance between OMCs to maintain high prices across-the-board. Resultantly, the competition to grab the largest market share will provoke efficiency in the procurement process in a bid to incur the lowest average cost and offer the best rates within the permitted band. A possible ramification of this system is that the OMCs may compromise the quality of petrol or diesel-like in the case of HOBC – offered to the public, which must be strictly monitored.

However, the unfortunate part is that policymakers are likely to abide by the extant norms of petroleum pricing instead of partaking in deregulation of the process. In that case, a further slashing of the PL is the go-to option to pacify frustrated inflation-stricken citizens. The government has already amassed Rs. 275.3 billion revenue from the PL in first-half of FY21 against Rs. 137.95 collected in the same period last year. It will not be a wise option to pursue the target of Rs. 450 billion for the entire FY at the miseries of commoners.

Plastic Waste Is The New Gold: Informal Vs Formal Sector

By Khadija Zahra

According to a WWF report, 65 percent of the waste that ends up only being waste is plastic packaging, bottles, and bags. With the booming population, increased consumption, rapid urbanization and luxurious lifestyle the annual production of solid waste in Pakistan has also increased by 2.4 percent and plastic nearly contributes 6.4 million tons.

Per capita, production of plastic in Pakistan is only 0.8kg which is lower than the global average of 1.42kg but our authorities due to lack of infrastructure, policy, government support, and technology can hardly manage to collect half of our produced waste and mismanages the waste by 96 percent and the collected waste is either incinerated or dumped. The street scavengers ended up gathering 70 percent of plastic waste as there are no estimated numbers that how much labor is engaged in this sector thus their efforts in waste picking, economy and reducing environmental impacts are unheralded.

Plastic is severely harmful to the water bodies, land, air, humans, animals and everyone. A recent study about the arctic revealed the presence of nearly 12,000 microplastics on every liter of the ice sheet. How it gets to the place where someone hardly lives the reason is, it is ubiquitous and not potentially biodegradable. It is surprising how plastic can be co-opted to reduce harm to the environment.

Asian columnist believes that the global recycling industry can employ more people on planet than any other industry, agriculture is an only exception. We must fill our policy gaps and set specific yearly recycling goals. Informal recycling is a common way to earn money in developing countries but promotes child labor and causes severe occupational hazards. In developing countries around the world, 15 million people are waste pickers. The potential factor that pushes people into the job of garbage picking is poverty. When they are given the choice between starving and waste picking, they ultimately choose the latter.

Informal Recycling

Recycling is the best alternative to manage the growing plastic waste problem. Speaking of the formal recycling practices it ensures workers' safety, recovers 90 percent of the energy, produces valuable products, contributes enormously to the economy and most importantly negates child labor. But the Government and locals are usually unconcerned about effective waste management and it has never been discussed as a national agenda or government failure, so the informal waste recycling is still thriving.

The waste moves from garbage pickers to the Godown where the plastic is hardly segregated and then sells it to the factories. They buy the waste based on color and makes the grain out of the waste and either produce a product themselves or sell it to the factories

to manufacture a product. But these factories directly manufacturing or buying waste plastics and raisin are not clean facilities because the waste is not treated through proper steps and has impurities like food particles, feces, inorganic waste, etc. and even produce waste as told by different locals in the Band road facility. Secondly, the product quality is not satisfying so the market prefers imported products and it ultimately reduces the reliance on the recycled product. Our Government officials do not recognize the efforts and problems of this sector. As told by the head of the small grain-producing shop in Band Road "Our business is going through a downfall as the factories prefer imported grain and government has never answered our requests of providing us a loan to switch from dirty practices to clean recycling".

Formal Recycling

Green Earth Recycling is the only state of the art facility all across Pakistan supporting the notion of sustainable development and contributing enormously to Pakistan's economy and reputation. According to the Manager Business Development, Syed Bilal Termezi they are currently working on UNDP's project in collaboration with KPK Government to promote tourism. He said, "KPK government was initially importing these plastics from Estonia but now we at Green Earth Recycling facility are making our own 95 percent recycled resorts and our national product is promoting eco-tourism."

He is also running a school that aims to reduce child labor and provide free education to the children of their employees and especially garbage pickers. According to him, the Government is currently providing soft loans to the informal sector, but it is not sufficient.

The informal sector is very limited and without any external aid, they can only recycle a small fraction which is not very contributive towards the economy. Shutting them down is not a sustainable approach rather the government should support them towards more effective waste management which is only possible through formal recycling practices.

Asian columnist believes that the global recycling industry can employ more people on planet than any other industry, agriculture is an only exception. We must fill our policy gaps and set specific yearly recycling goals. Many societies around the world segregate their waste at the household level as they have installed 3 or 5 bin systems labeled as metal, paper, glass, plastic, and tetra pack. As a citizen of Pakistan, we should take responsibility for our trash.

Protest For Uighur Muslims

Syeda Sana Rasool

LAHORE: Friends of Uighur Muslims have arranged a demonstration to demand that alleged atrocities against them should end in China.

Speaking to the protesters, Maulana Ahed Bilal, Ziaul Islam, and Samiul Haq alleged that Uighur Muslims are facing atrocities in China. They said that these Muslims are not allowed to perform their religious rituals freely and are forced to eat un-Islamic food. They said these Muslims are not allowed to perform Hajj and say their prayers.

They said Uighurs are not allowed to give their children Muslim names. They further alleged that China has been keeping two million Muslims in torture cells, and this issue should be discussed in OIC. They said that they will keep on the rising voice in favor of Uighur Muslims in all cities of Pakistan.

t is pertinent to mention here that Uyghurs are an ethnic Muslim minority living in east and central Asia. Around 11 million of these Turkic Muslims make half of the population of China's Xinjiang province, which is the country's biggest region spanning over 1.6 million km square, bordering with Central Asian countries.

In the name of a crackdown on religious extremism, China has been capturing, detaining, and torturing millions of Muslims in internment camps since 2017. China, however, rejects allegations, saying that the facilities are vocational 'concentration camps' to re-educate and train Muslim ethnic minority groups for their rehabilitation and redemption in its attempt to fight terrorism and religious extremism.

The UN's concerns about IIOJK are valid

Kashmiris and international supporters must keep the global pressure on India through international fora like the UN

Andrew Korybko

Fernand de Varennes and Ahmed Shaheed, the United Nations (UN) Special Rapporteurs on minority issues and freedom of religion or belief respectively, published their concerns about Indian Illegally Occupied Jammu & Kashmir (IIOJK) last week. They criticised New Delhi's August 2019 abrogation of Article 370 as "suggest[ing] the people of Jammu and Kashmir no longer have their own government and have lost power to legislate or amend laws in the region to ensure the protection of their rights as minorities." The experts also warned that "The number of successful applicants for domicile certificates that appear to be from outside Jammu and Kashmir raises concerns that demographic change on a linguistic, religious and ethnic basis is already underway." In response, India claimed that the report "calls into question the larger principles of objectivity and neutrality that the SRs are supposed by the Human Rights Council to adhere to." Interestingly, all of this occurred while India took a group of 24 foreign Heads of Mission on a tour of the disputed region in order to attract more investment there.

No matter what India claims to the contrary, the UN experts' concerns about IIOJK are valid. The very purpose of the region's prior autonomy was to grant its people their own quasi-government, albeit under India's ultimate control, in order to legislate and amend the laws of their region. Removing those already minuscule and largely symbolic rights literally took away their power to do that at the level that they've become accustomed to over the decades. This is not a subjective or partial observation but an easily verifiable statement

of political fact. The same holds true about their concerns regarding what others have described as India's demographic engineering. UNSC-recognised disputed territories aren't allowed to have their demographics unnaturally altered, though this is now much more likely to happen ever since last year's promulgation of India's so-called "domicile law". Although India claims not to have such an intent, there's no denying that its recent administration changes nevertheless facilitate that possible outcome.

For these reasons, India is being dishonest by condemning the UN experts for allegedly lacking objectivity and neutrality. Even a casual familiarity with the facts discredits India's claims, but New Delhi is desperate to push back against any criticism of its activities in Occupied Jammu & Kashmir because it fears that its foreign partners won't invest there if they're more well aware of what's happening. The government believes that courting increased foreign investment into the region will result in normalising the post-annexation status quo after influential stakeholders realise that their interests are best served by remaining silent instead of taking India to task for unilaterally destabilising the situation in contravention of international law. It's one thing for other countries to invest in disputed territories, and another entirely for them to do so when there are credible reports about massive human rights violations being carried out. These collectively include the state's rampant violence and extrajudicial killings on top of anti-democratic trends and demographic engineering.

The problem with India's policy is that it's bound to fail because the world is already well aware of what's happening in Occupied Jammu & Kashmir. The latest UN Special Rapporteur report proves this. Some countries might indeed decide to invest in those territories regardless of the credible humanitarian concerns involved as they pursue their self-interests, but it's unlikely that many Western ones (which are among the most influential in the world) will follow their lead. To the contrary, Western countries tend to be more sensitive to democratic and humanitarian issues than their Global South counterparts, though that also doesn't mean that they'll endanger their bilateral relations with India out of solidarity with the Kashmiris. Rather, the most realistic scenario is that UN criticisms of India's activities in Occupied Jammu & Kashmir will continue, Western nations will probably decline investing in those territories, but India's bilateral ties with its many partners won't be impacted much by these issues if at all.

What the Kashmiris and their international supporters must therefore do is keep up the global pressure on India through international fora like the UN and the media in order to prevent the normalisation of the post-annexation status quo by any of New Delhi's partners. All countries and companies that decide to invest in Occupied Jammu & Kashmir must become targets of an intense information campaign that's first aimed at drawing global attention to their controversial investments and then accuses them of turning a blind eye to credible reports of the massive human rights violations there if they refuse to reverse their course. The purpose in doing so is to impose immense reputational costs against those countries and companies that go along with India's annexation and therefore contribute to the Kashmiris' ever-worsening plight. Just like the Palestinian cause pioneered the Boycott, Divestment, Sanctions (BDS) movement, so too should the Kashmiri one do the same, and both should actually join forces in order to make their efforts more effective.

Rise Of Women: Shattering Barriers Around Globe

Azmina Ali Khan

I still remember the good old days when I went on a Global Community and Development Program via AIESEC. My short trip to the mesmerizing island of Mauritius as an exchange participant had been a life-changing experience for me.

While working there with the NGO named "Gender Links", I got a chance to hear vulnerable life stories of some women who had been abused in their lives and how Gender Links had been of a ray of hope in their tragic and crestfallen lives.

Gender Links had been promoting Feminism. I was not willing to work with them when I heard about it for the first time, however, I did start working and then realized how mistaken I had been in my understanding of the main objective of the movement called 'FEMINISM' and when I came back and my friends criticized me for being one of them. I doubt even many of you had misinterpreted the theory itself.

When I think of the squabble in Mauritius my mind opens its doors for the flow of numerous thoughts. I find myself brooding about a number of social, political and economic issues that become a catalyst to unrest and led towards people to silently undergo abuse.

Amidst all this I notice myself to be more inclined upon caring for the controversy primarily gender based than any other due to the scars it has inflicted upon the victims. In contrast to the general belief, it is not just women who suffer; research has shown that men have fallen prey to this monster too.

Understanding feminism in true sense is quite important because it will help in gaining better understanding of issues faced by both genders. It is quite crucial remove misconceptions and come up with a balanced and qualified strategy.

The unrealistic satire of feminism as anti-male/masculinity has been used to cripple feminism as well as distract from conversation about actual gender discrimination. Provided that the main aim of feminism is to advance gender equality, not a specific gender, it is not required of it to 'espouse masculinity', nor femininity, for that matter. The word "feminism" does not means making women more important than

men, when actually it means promoting women so that they're equal to men and have the same chances.

Feminism is a concept that a female should be valued for being an individual instead of simply being a daughter, wife, sister or a mother. It is the belief that women have the same value as men and deserve equal opportunities and equal pay. Feminism is the belief that the identity and individuality of a women does not ought to be amended once she gets married.

Feminism is the belief that when the privacy and modesty of a woman are encroached upon, it's not the survivor's fault. It is a concept that each individual ought to have full right to precise their own sexual identity and orientation without hesitation. Feminism is a conviction that 'consent' should be prioritized before anything else.

'Misandry' – Utter misconception

Our society as brought a lot of difficulties in the life of feminists. One of the chief causes for this is a lack of awareness and mindfulness in our society. Feminism is not seen as a movement that ensures equality but something that will incite encounters among genders.

The word 'Feminism' has been considered a double meaning word and there lies an extensive gap between the actual definition in the world and the meaning defined by the society. This inaccurate definition has led to misconception and much controversy.

The distorted understanding of feminism amongst the society has become a reason of prejudice and has resultantly transformed the word's meaning to represent a drive that pursues female power and the definitive destruction of male power. The word feminism has been considered synonymous with misandry by many. The predetermined concept of feminism of the society has attained negative connotations over the years, and this has altered the word to mean the superiority of the female gender, this concept is a not even near to the true definition: the equality of the sexes. Hence, the word remains a subject of debate.

The belief derived from misinterpreted definition has unfortunately been widely supported and is difficult to set straight. There is a threat as the emergent population may continue to globally maintain gender roles and endure to regard the concept of feminism with disregard, claiming that the concept feminism is correspondent to desiring death upon the male gender. The true definition of the term for gender equality is lost in the waves.

Feminism is a way of life and not just a movement. It cannot work in quarantine. In order to solve the problem of gender bias, we need to solve the problems of class, caste, ethnicity and religion. Women of color and those who belong to the underprivileged communities have always been a victim of exploitation. Gender equality is for everyone irrespective of their class and race.

I am not a feminist as defined by the society. I am a woman of dignity and with high aims and ambitions. As a women I would like the other women to kindly own up this word and wear it like a badge of honor. I used to hear accusations and statements upon myself as to admiring the utter misconception that has been created with regards to the concept of feminism.

On the contrary, I would no longer feel uncomfortable when somebody expresses such an opinion. I will merely laugh at their obliviousness. I believe in feminism as a lifestyle where both the genders are given equal opportunities in the fields they can prosper. There is undoubtedly a scope for men's rights to improve simultaneously and in synchronization with women's rights: as the feminist movement seeks to change.

The Next Big Thing: Digital Punjab

Ayesha Imtiaz

Pakistan is a developing country and faces many challenges such as historic rivalry with India, large IMF, World Bank, Asian Development Bank debt, and many others. Not to forget political instability, unemployment, illiteracy, lack of technical training. According to the digital evolution index 2017, Pakistan is a watch-out state which means a state who faces severe challenges in digitalization. In 2019 Prime Minister Imran khan developed a framework of digital Pakistan to transform the country into a digital state. The purpose of digitalization is to avoid corruption, to ensure the accountability process, to increase sustainability and growth in trade. It also helps in creating an attractive environment for diaspora and international companies. This will enhance sectoral partnerships of government and private sector. Although all political parties make policies practical manifestation is not done in a true spirit. Despite all these problems, Pakistan strives to develop and flourish in the technological sector. Prime Minister Imran Khan on December 5, 2019, launched the Digital Pakistan Vision, a comprehensive plan which will not only help the country in competing in the digital market globally but also create jobs and ease for the people of Pakistan. The Digital Pakistan program operates directly under the Prime Minister Office. The major pillars of Digital Pakistan are:

Connectivity and availability of the internet to the people of Pakistan that is the fundamental right of people.

Promote the use of technology in education, health, agriculture, and other key socio-economic sectors.

Ensuring women and girls have equal access to ICTs will help reduce inequalities and support gender equality and providing training to all segments of society.

Make Pakistan an attractive destination for investment as well as creating jobs for the people of Pakistan especially youth.

E-governance that digitizes intra-government operations and processes towards a paperless environment and developing a digital infrastructure along with proper usage of digital technology.

The wind of change has begun in Pakistan. Change is the only constant. To overcome barriers, the states adopt digitalization to pursue their social, economic, strategic, political, foreign objectives. Along with superpowers the developing countries are also trying to adopt digitalization to achieve and strengthen their socio-economic fabric. So, Pakistan is right on track and moving towards digitalization. Speaking of Punjab, the largest province of Pakistan in terms of population is contributing to the national economy with more than $173 Billion (GDP, 2017). In this regard, dynamic steps have been taken under the leadership of CM Usman Buzdar, for the digitalization of Punjab.

Punjab Information technology board (PITB) with the assistance of the Ministry of information and telecommunication launched different programs. PITB, School Education Dept. & PMIU collaborated for a dynamic online education program for school children during the lockdown in 2020 known as "Taleem Ghar." It is providing course lectures on science and mathematics from grades 1-10. Moreover, the e-Transfer app launched for facilitating around 375,000 teachers in 50,000 public schools and transferring of 45,000 teachers across Punjab. Digitization of transfer procedure allows teachers to apply for transfer

from one school to another via mobile phone and track their application. 15 different taxes/levies in 6 departments have been digitized allowing citizens to pay these taxes from their smartphones and Rs. 4.75 billion in revenue collected.

Mobile Video Conferencing Solution for Punjab Govt is launched for business continuity in the wake of the Covid-19 outbreak. A centralized Human Resource Management System (HRMS) launched for all departments in Punjab to maintain accurate, digitized pro?les, skillset, postings, and performance records of its employees. E-Filing & Of?ce Automation System (e-FOAS) is established for transparency and a paperless environment.

CM Punjab also launched an e-Challan Payment System for online payment of ?nes for traf?c violations. Pakistan is the second youngest in the South Asian region after Afghanistan and the total population of 68 percent are below the age of 30, 32 percent are between the ages of 15-29 years. Imran khan's government supports youth empowerment programs. In this regard, Usman Dar as Special Assistant to the Prime Minister on Youth Affairs created the National Youth Development Framework (NYDF). For empowering the youth of

unemployed youth in digital freelancing and soft skills to enable them to earn a sustainable monthly income.

Five centers are dedicated to females only including Lahore College for Women University and overall engagement of women has increased by 54%.

Hotels and salons that pay their taxes through debit cards and credit cards will be given tax relief of 11% (5% instead of 16%). For economic activities and digitalization, more than 75 new branches of Punjab Banks are functional and generate a profit of S14.0 Billion. More than 28 commercial banks have been given access to land records digitally. The Pakistan Citizen Portal was established in the direction of PM Imran Khan to create a robust link between the government and the people of Pakistan. The portal had enabled the citizens to highlight their issues and seek intervention at the highest level for their resolution. More than 34,584 complaints have been registered on the portal for Punjab from which 31,231 have been sent to the relevant departments of Punjab.

To Deal with the health sector during the covid-19 situation, the digitalization process became faster and the National Security Council (NSC) established the National Command Authority (NCA). They used the Test, Trace, and Quarantine (TTQ) strategies to restrain the vicious spread of Covid-19. TTQ is aimed at identifying disease spread, focused clusters/hotspots to enable targeted lockdowns, and need-driven resource optimization at all levels. So through TTQ strategy Pakistan successfully traces hotspots and under section 144(6) of the Code of Criminal Procedure, 1898, which grants the provincial government the authority to issue orders in the public interest to impose a ban on certain activities to prevent "danger to human life, health or safety" applied smart lockdown.

Punjab, Chief Minister Punjab's e-Rozgaar Training Program is launched in collaboration with Youth Affairs, Sports, Archaeology and Tourism (YASAT) Department. It aims to train

So, the federal government strategy is fully implemented by the Punjab government but there is a loophole. Policies, applications, forums were established but a lack of IT knowledge still exists in masses. The only thing that is going to fast track our progress towards said goals is providing enough training to the people of Pakistan. Without practical training, all these plans will remain just the plans. Since technology is nothing without the knowledge of how to use it, Pakistan is on the right track and what we need is proper implementation as well as constant attention by the Government of Pakistan.

The Innovations Of Quantum Computing Technology In The Modern Era!

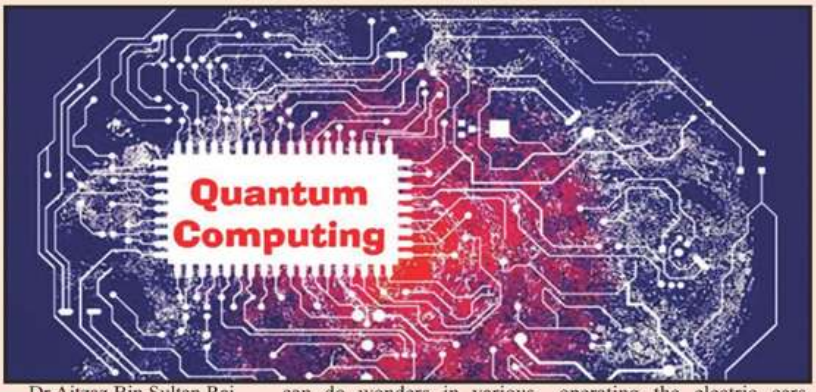

Dr Aitzaz Bin Sultan Rai

Without change, there is no innovation, creativity, or incentive for improvement. Those who initiate change will have a better opportunity to manage the inevitable change." William Pollard

In contrary to conventional computers, quantum computers (QC) could store massive information and can break the codes that were considered earlier resilient. The QC promises to offer exciting developments in various fields, from materials science to pharmaceuticals research. Many computing research institutes including Google, IBM, Intel, Microsoft, NASA, and many others have revolutionized the concept of QC to manufacturing pocket calculator sized computers. A "qubit" is the basic unit of quantum data, the quantum equivalent of the "bit" in a classical computer. The fundamental physics behind QC relies on generating pairs of qubits that are "entangled," means the two moieties of a couple occur in a solo quantum state. The world's superfast computers have quintillions of bits. In contrast, the quantum chip contains much more extensive information with only 72 qubits.

Though the concept of QC is reasonably offbeat as compared to classical mechanics, it can do wonders in various fields ranging from medical research to security checks. It can tailor highly productive pathways of drug development, in which proteins are engineered to manufacture new vaccines. Novel drug therapies can be generated to combat serious ailments, including but not limited to cancer, various neurological and heart diseases.

By utilizing quantum mechanics, Google, in collaboration with IBM, has manufactured the world's highest efficiency quantum computer chip. It can accomplish a mathematical task within seconds with great precision, that the world's fastest supercomputer could perform only in months and years. The practical value of QCs lies in power saving. The energy consumption of a system is about 20 kW, versus the conventional supercomputer's consumption of 10-20 MW, consuming almost 1,000 times additional energy.

Another critical utility is in operating the electric cars, mainly based on efficient cell chemistry of the batteries. Quantum mechanics can be implemented in simulating battery-cell chemistry, boosting the performance limits and ageing of battery cells. Daimler, the parent company of Mercedes-Benz, in collaboration with Google, has developed more powerful, robust, and less expensive vehicle fuel batteries. Relevant to artificial intelligence, machine learning can also be steered at high speeds on a QC. The high computational efficiency of QC will also help the world in combating the food shortage by manufacturing the fertilizers. It comes into play by providing a new way to improve the catalysts used in the production of ammonia. Moreover, quantum mechanics can be utilized in designing the world's most powerful supercomputers to model high-resolution weather forecasts.

"Every once in a while, a new technology, an old problem, and a big idea turn into an innovation." Dean Kamen

As every new advancement comes with a price, the QCs have some drawbacks too; the topmost is the "decoherence". The system makes calculations in nanoseconds and can retain the information only for microseconds. This flaw is attributed to its extreme sensitivity to heat, radiation and magnetic field. That's why the QC chips are protected by multi-layered shielding and cooling down to -273 °C. Despite all, quantum computing technology is still in its infancy stage. It's a new paradigm that is on the threshold of execution. Because of their unique special individualities, we are opinionating the hybridization of the classical computers and quantum processors, so that each system can contribute its peculiar métiers.

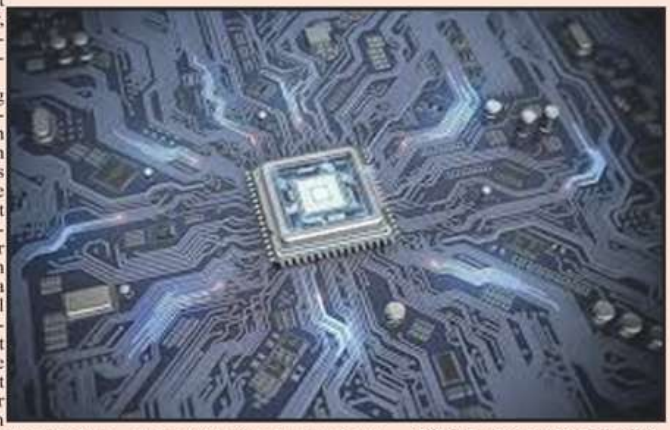

Social Media Is Smokes And Mirrors

By Alina Rashad

Social media is a double edge sword. You all the know the drill of social media, uploading pictures, status, sharing stories and commenting. Social media has allowed us to transfer a copious amount of information that will ultimately lead to progress and quantifiable change. But it's kind of a red herring towards reality. It has the ability to make a silk purse out of a sow's ear.

Social media is all about creating an idealized version of oneself and hence escaping the reality. We need to understand that every human on this earth is not utterly enjoying life and if their social media implies otherwise then they are lying. What people show online is not entirely true. Not everyone is on cloud nine.

If someone has posted a perfect picture of having fun that doesn't mean they are not passing through their boring routines. Behind every perfect photo, there are thousands of not so perfect photos. Basically, putting up the collection of the best and brightest moment in social media is too stressful.

For e.g. you just saw a picture of your friend enjoying at the beach. Now you eat your heart out and think that why am I not on the beach? Why am I not enjoying my life the way she is? What you just missed from that photo is that she spent an hour to take photos, looking for the perfect view, moving from one place to another just to get a perfect shot, dressed up to the nines just to get colorful picture and posing in different ways to look natural. Then selected the best one, posted it and missed enjoying the moment in staging photos just to get admiration from the people she barely knows.

There are billions of other examples related to the reality show on social media that people think they are directing and acting. From joining gym and posting a photo with a treadmill saying #fitnessgoals, when in reality you don't run on a treadmill for more than five minutes. Posting a healthy meal picture, when in reality you ate pizza #Healthylifestyle. Putting up make-up, taking million selfies, editing it with filters and posting it on your social media saying #nofilter #wokeuplikethis.

People are really making a mountain out of a molehill to live their lives to be aesthetically pleasing across social media. It's all Greek that one lives a life of peaches and cream. Next time you think that someone's life is better than yours, think twice because it's all smoke and mirrors.

You all are familiar with the function of currency and in social media these likes, comments and sharing stories are the currency by which we assign value to something. You are the product in social media. When you spent an hour to edit a photo and you put it on the social media, you are basically allowing others to value you. You are like a sitting duck, waiting for the people to tell you your worth.

Sometimes you meet with people to take pictures, when in reality you just don't want to see them. People are sitting at dinners and their heads are buried in their phone, WHY? They took a photo and now they are thinking of the best caption for it and getting into anxiety. This photo is the validation of you being socially active with your friends and family.

We take our product off the shelf when it's not selling. Same is the case with humans, you posted a picture and if that picture doesn't give you above 500 or maybe 1000 likes, you take it off. You need to understand that beauty is only skin deep, you can't let others decide who you really are. Not everyone is going to like you and not getting likes or comments doesn't make you any lesser than anyone else.

What people are not understanding is that it's not the social media which is causing the trouble, it's the dark side of people. Social media is just illuminating the darker side of people. Once you have recognized the problem, you can fix it.

Nine times out of ten you spent two hours on social media and you get under someone's spell. You start to think they are in the seventh heaven. HERE you need to nip this problem in the bud and for that you have to adopt audit social media diet. Just like you examine carefully everything before you eat, here you have to audit what goes in your head. Unfollow pages that is making you delusional. Unfriend people who are just faking everything and making you feel less special.

Social media is a great way to connect but know that not everything is as it seems to be.

Create a better online experience for yourself. Follow people who inspire you to become a better version of yourself, follow actors as they do provide you entertainment, follow pages of religion as they are the way to peace. In short follow those who brings the best out of you. You are spending almost two hours every day on social media and you should feel better, motivated and inspired when you get offline.

Pakistani Researchers In Top 2% Of The World Researchers List!

Sania Nister Advisor to Prime Minister among 8 Females researchers out of 81 Researchers from Pakistan, who have Secured their Positions as top 2% of Scientists of the World – Published by Stanford University.

The exhaustive list released by Stanford University has 159683 top 2% researchers of the world from various fields of research. The report was prepared by Prof. John PA Loannidis of Stanford University and his team. The list is made based on the citations and h-index data. Scientists are classified into 22 scientific fields and 176 subfields. Field and subfield-specific percentiles are also provided for all scientists who have published at least 5 papers. Career-long data are updated to end-of-2019.

There are 81 researchers on the list from 38 different universities of Pakistan, eminently from Commission on Science and Technology for Sustainable Development in the South (COMSATS) University, University of Karachi (UoK), The National University of Sciences & Technology (NUST), Quaid-i-Azam University (QAU), University of Agriculture Faisalabad (UAF) and University of the Punjab (PU), working in 31 different fields of research e.g. Artificial Intelligence & Image Processing, Applied Physics, Environmental Sciences, Mechanical Engineering & Transports, Medicinal & Biomolecular Chemistry, and Plant Biology & Botany.

The successful researchers are affiliated with universities in different provinces of Pakistan. Islamabad holds the highest number of researchers (34) majorly from QAU, COMSATS, NUST, and International Islamic University (IIU), followed by Punjab (23) – mostly from UAF, PU Lahore and Government College University (GCU) Lahore and Faisalabad. Not far behind is Sindh with 15 researchers on the list, most of them are from UoK and The Agha Khan University (AKU). 9 researchers from the province of Khyber Pakhtunkhwa (KPK) have made their place on the list who represent Abdul Wali Khan University Mardan (AWKUM) and Sarhad University of Science & Information Technology (SUIT).

Among these researchers, 8 are females from different universities, including Sania Nishter (Heartfile Pakistan), Special Assistant on Poverty Alleviation and Social Safety to the Prime Minister of Pakistan, with the status of Federal Minister, and BISP Chairperson. Other female researchers are Noreen Sher Akbar (NUST), Khalida Inayat Noor (COMSATS), Darakhshan Jabeen Haleem (UoK), Ayesha Kausar (QAU), Bina Shaheen Siddiqui (UoK), Tasneem Gul Kazi (University of Sindh), and Asghari Maqsood (Air University (AU) Islamabad).

Considering the contribution of universities/institutes, COMSATS has the maximum number of researchers (9) on the list, followed by QAU and UoK having 8 each, NUST and UAF each with 5 researchers, IIU has 4, while PU and AKU each has 3 researchers on the list.

There are 10 outstanding researchers who have made their place in the top 200 of the world in their respective fields. Muhammad Aslam Noor (COMSATS) is ranked 5 in Numerical & Computational Mathematics, Muhammad Ashraf (UAF) 54 and M. Yasin Ashraf (NIAB) 72 in Plant Biology & Botany, ?Rahmat Ellahi (IIU) 66 and Noreen Sher Akbar (NUST) 115 in Mechanical Engineering & Transports, Muhammad Zaman (QAU), Anwar Hassan Gilani (AKU), and Khalid Mahmood (PU) are also in top 200 of their respective fields.

Distinguished 8 researchers who have 500+ publications are M. Iqbal Choudhary (UoK) 1028 Publications, Khalid Mohammed Khan (UoK) 641, Muhammad Aslam Noor (COMSATS) 615, Nadeem Javaid (COMSATS) 589, M Sharif (PU) 552, A. Waheed (NUST) 522 and Muhammad Ashraf (UAF) with 502 publications. Among them, the highest citation score of 4.33 is secured by Muhammad Aslam Noor.

20 February World Day of Social Justice

"A call for Social Justice in Digital Economy"

Minahel Akbar

The popular contention that the rich get richer and the poor get the poorer appears to be largely based on fact particularly within the present global context. Social justice is a recent concept born of the struggles surrounding the industrial revolution and the advent of socialist. In today's world, an enormous gap in the distribution of wealth, income and public benefits growing faster reflecting a general trend that is morally unfair politically unwise and economically unsound.

Injustice at the international level has produced a parallel increase in inequality between affluent and poor countries. Social justice means that everyone's human rights are respected and protected.

Everyone has equal opportunities. Everyone has the right to spend their life happily in accordance with their mind while keeping in mind the human rights of others. Social justice depends on human rights and equity. Social Justice applies to all aspects of society including race and gender and tied with human rights. Racial inequality is one of the most common social justice issues in the world.

Social Justice tells the equal rights of everyone in the economy, politics and careers. It encompasses economic justice. Social Justice explains us getting equal health care treatment is our social right. We have equal right in education but due to financial conditions, some students having calibre cannot get higher education.

They sacrifice the field of their interest like if we talk about a pure science pre-medical student who wants to be a doctor but lack social justice in educational policies, limited seat criteria and a heavy amount per semester causes brainstorm and students commit suicides or take admission in other fields in which they don't have any interest till the end of their degree meanwhile same with the engineers after their graduation they are not familiar with the practical field of work.

The point to be noted is that we are producing impassionate students in society having no spark to work hard in their field. The base is so rough so how can we imagine the productive and worthy work from the coming generation. In this digital generation, we need more justice equality policies and a learning framework so the upcoming youth can produce productive and innovative things in reality, copy-pasting in facial expressions and digital marketing is everywhere. To combat this we need to learn the technical things to progress in society so no one can harm us and we can grow with the flow.

The theme for world social justice day 20 Feb 2021 is "A call for Social Justice in the digital economy". As above social justice provides human rights with fair context and equally, everyone can enjoy the rights of being a human. No one can suppress others on the basis of wealth status gender and colour discriminations. Lockdown has exposed the people earning through digital media and growing their digital economy through social media platforms. Social justice aims at everyone can generate economy through social media as this platform is for all to become a creator and earn.

World Interfaith Harmony Week and Pakistan

Muhammad Anwar Farooq

Interfaith harmony means bringing peace and tranquillity promoting among people by positivity. There is an interrelationship among people of different religious beliefs at the individual and institutional level which projects a positive picture in the polity of nations. Interfaith harmony encourages the dictum to live and lets others live peacefully. World Interfaith Harmony Week is an annual event observed during the first week of February. World Interfaith Harmony Week (WIHW), conceived to promote peace and nonviolence, was first proposed by King Abdullah II of Jordan at the United Nations in 2010. Recognizing the imperative need for dialogue among different faiths and religions to enhance mutual understanding, harmony and cooperation among people, the General Assembly encourages all States to spread the message of interfaith harmony and goodwill in the world's churches, mosques, synagogues, temples and other places of worship during that week, voluntarily and according to their religious traditions or convictions. The World Interfaith Harmony Week provides a platform—one week in a year—when all interfaith groups and other groups of goodwill can show the world what a powerful movement they are. This week will allow for these groups to become aware of each other and strengthen the movement by building ties and avoiding duplicating each other's' efforts.

Pakistan was created in the name of religion Islam. The flag of Pakistan signifies the existence and importance of minorities of the state. The constitution 1973 of Pakistan protects the minorities' rights to live in the state freely. Supposedly, Pakistan is considered an unsafe country for non-Muslims to reside in. Previous outbreaks on holy sites of non-Muslims were broadcast on international media that Pakistan is not a safe state for non-Muslims. If one looks closely, these terrorist attacks not only harmed the holy sites of nonMuslims but also the holy sites of Muslims. Article 20 of the constitution

of Pakistan provides equal rights to minorities for religious practices. They have the liberty of worship and follow their cultural practices. Article 8-17 of the 1973 Constitution focuses on the fundamental rights of all citizens living in Pakistan. Even section 1(4) of the Enforcement of Shariah Act lies down: 'Nothing contained in this Act shall affect the Personal Laws, religious freedom, traditions, customs and way of life of the non-Muslims'. Quaid-E-Azam, the founder of Pakistan declared that: "Only people with an equal awareness of both western societies and Islamic societies could run the newly created Pakistan properly. Equal rights for minorities and females, democracy, and tolerance should be the main motives of the new state; and that sectarianism and extremism would not find any place in Pakistan".

Now the world is observing interfaith harmony week and in connection to WIHW, a special representative to the prime minister on religious harmony has said interfaith harmony councils will be established all over the country to promote religious tolerance among the people of different religions and religious sects. No doubt, interfaith dialogue is urgently required to eradicate the menace of sectarian violence, extremism and terrorism. The government also planned to include topics on religious tolerance in the curriculum at schools and colleges to promote religious harmony. The government will arrange joint sittings of representatives of different religions and religious schools of thought regularly to promote religious harmony and interfaith dialogue. It is decided that religious seminars and congregations will be held during the month of Rabi-ul-Awal on the topics of peace, affection, unity and leniency in the light of Seerat-e-Tayyaba. No doubt, The interfaith dialogue and intersect harmony is the best and ideal way for peaceful coexistence in society. No doubt, it is a good idea of the government to establish interfaith harmony councils all over the country at the union and tehsil council's level to promote harmony in the society. It is hoped that the outcomes of the decisions would be positive.

Pakistan is a religious state where people who belong to different faiths are mostly living peacefully. No religion neither allows nor teaches to be violent against other religions. Instead, some other forces are spreading hate among people for which the state needs to act against these culprits. No doubt, the majority of the population is following Islam as their religion, the religion of peace and harmony. The majority of the population continued to serve and strengthen interfaith harmony. Many individuals and organizations in Pakistan are playing a very strategic role to promote interfaith harmony among the people in Pakistan. Pakistan is very rich in its culture and history so there are numerous religious places of Hindus, Sikh and Christian communities. So, a multi-cultural and multi-religion existence is very important in education, trade and art. It is an obligation to the state to guard the phenomenal religious history, cultures and rights of Non-Muslims to provide them with a strong and peaceful presence in the State. The real message of interfaith harmony is in need to spread to deal with controversial problems like sectarianism. It is the responsibility of the government as well as every citizen particularly of parents, teachers, religious scholars and political leaders to play their vital role in promoting interfaith harmony in Pakistan.

A Multi-Cultural Society is Actually a Rich Society!

Dr Amara Khan

We all are familiar with the fact that the world has become a global village. Today, we are living in a society that comprises of various ethnicities and cultures. It is no denying the fact that there are several benefits that emerge from multicultural environments, for the diversity of the races, cultures, as well as traditions make the society unique as well as attractive.

Technology and social media have revolutionised the twenty-first-century. We as Pakistani citizens have to prepare our next generation for a tolerant place. We all should do something for the future to value. We need to ground ourselves not only in our own cultures but also we must approach other cultures in order to understand, represent, and evaluate the remarkably national conditions. When we are exposed to distinctive customs of life, we gain an enormous extent of feelings and lives to discover. This can happen in both a personal and professional approach.

I am writing this so that you see that meeting diverse races each day is an inordinate treat to be progressive and to acquire an astounding life. It should be a pleasing experience to live in a world that comprises a mixture of several cultures. One of the major benefits is that the inhabitants learn much tolerance on other ethnicities as well as customs. In addition, living in a multicultural social setting may offer an individual the opportunity to enlarge one's cognitive thinking and also to gain knowledge of remote cultures. Therefore, a multicultural society gives an individual an upper hand in understanding new cultures which raise one's awareness with regard to the issues of the world. It is also a human desire to acquire new experiences as well as broad knowledge which is well offered by living in a multicultural social setting.

With today's globalisation, connecting people from different parts of the world, societies have become increasingly multicultural. In many ways, it should be seen as a multicultural mosaic, where each culture has a say in creating the picture shown to the world. We need to focus on how every society, living side by side, has to fit and adapt to each other. In the beginning, people may find it difficult to live next to people with another culture for the fear that their norms would crash, and create a divide between them. However, they should try to adapt to each other to live peacefully. In order for a society to function, the different parts, or people, have to co-operate.

The impulse to compare is an elementary human attribute. I consider comparison is stimulating and inspiring. Considering the way we are

both comparable and diverse makes us better understand the nuances of both experiences whilst indorsing empathy.

But where we see multiple benefits, there are few narrow-minded people who think that the culture of the host society would fade away as a result of multiculturalism so they oppose embracing different cultures. Such people view and present ethnic diversity in a manner that affects social trust negatively. The proponents of such arguments support the ideology of differentials, which is a belief that there is a need to differentiate between different ethnicities and cultures in a multicultural society. They are of the view that dissimilar ethnic groups and cultures are unable to coexist. They further amplify their fears by promoting that a multicultural society brings about cultural differences that may divide society. Whereas the major reason behind such division is that one cultural group has a feeling that its religion and culture are superior as compared to the other groups. As a result, ethnic minorities suffer from racial disadvantages in a multi-ethnic setting. It is not only the adults who face this injustice but even the children are not spared and we see this discrimination in the non-provision of basic facilities such as the children's right to education. Children from minority ethnic groups many a time underperform due to them being in an unfamiliar environment with less recognition of their existence. Therefore, due to cultural differences in a multi-ethnic setting, there is a division in society. It pains me to discover that there are people amongst us who are so discriminating. There is no impairment in taking some time to understand the other person so that one can reduce the chance of distress, nevertheless, I still desire to imagine that the world is a better place when we feel positive about someone notwithstanding his/her cultural upbringing. In actuality, there are people out there who are far superior to who we contemplate they are. We simply fail to realise it for the tags we set before them. It is all about judgment, I presume. We give less significance to certain populaces just because of how they appear. Occasionally, we fail compassion and we are oblivious of it. We should be recapped that multiplicity is not a burden to living liberally but a venture to contact the world.

Despite having the intention of adapting, cultural differences can create a gap between people. Ignorance and prejudice might be two of the reasons why people find it hard to communicate with others, or do not want to learn more about their neighbouring cultures. As a consequence, we stay away from our neighbors, not wanting to learn about their culture. We think that cultural differences act as a dividing power between people. We should try to understand how people in developed countries, despite being aware of the differences in norms and traditions, choose to overlook them.

One can learn much by living in a multicultural society. We should write discourses as well as make movies to try to teach people about the importance of understanding various cultures. We need to focus on how finding the similarities unite people, whereas how not paying attention to other people's traditions can make adapting even harder. The lesson is, therefore, to try to pay attention to different cultural norms, because when one has knowledge about other people's cultures, it is easier to understand the different points of view.

We can write stories set in a multicultural country, showing various approaches on how to handle cultural differences. As a consequence, one has to take into account the variety of norms and traditions when communicating with others and trying to make a country work as a whole.

Acquaintance with one's own tradition is vital, nevertheless what is crucial is sympathy to what the country entails at the moment. It is that realization that makes an individual look external to his own cultural oyster into beneficial facets of other cultures. We should be open to other cultures in order to appreciate, replicate, and review the exceptionally national as well as international situations that are being represented in the written works as well as through electronic media. All inhabitants of Pakistan must go through the course of finding how the "us" and "them" break down and develop into "we, the people of Pakistan." We need to keep reminding ourselves that the developed countries do not exemplify one culture but integration of their various cultures.

The people of Pakistan need to break out of cultural nuisances. We need to decenter our thought. We all need to believe that cultural conflicts take on several forms and have happened in the past too. So all we need is to find out the way to be more open-hearted. It is not only the responsibility of the government. Every individual should perform her/his specific role. History shows that the young generation, especially the students, have always performed an imperative function in improvements and revolts in society. Therefore certainly, students, teachers, working men and women, and also homemakers can and do play a central responsibility in rejoining, inspiring, and supporting the logic of acceptance despite differences amongst the people. We must be more concerned with the forthcoming times.

Instead of critiquing, we should generate new love and hope amongst all. When the requirement is to accede to our heritages without rebuffing other cultures; we should not attempt to shape ourselves opposing other cultures. We do not want a denunciation of other people in our society, as that would segregate Pakistani people. I, therefore, request for unification with all cultures. We may not want to criticise but we do need to construe the beliefs of our people in minority. As thoughtful national individuals, we need to record the concern, anguish, and irritation of the people living as a minority. Instead of facing a manuscript reviewing history, life, activities, or cultures, we make learning easier by moving a step ahead and trying to understand other ethnicities and cultures and then we live life to the maximum by uniting and involving with people around us. We must avoid the use of markers as these just make the situation worse. To sum this up, living in a society which is multi-ethnic and multi-culture has many advantages for it gives individuals a chance to experience various ways of living through the acquisition of other people's language, customs, behaviors as well as art.